یک مجلسی تمثیل

شاعرہ عالمِ ارواح

یعنی

تنقید و تاریخ اُردو شاعری از سنہ ۱۶۶۸ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

مؤلفہ

سید مرتضیٰ حسین موسوی

ایم۔ اے (اُردو) ایم۔ اے (فارسی) لکھنؤ

اسلامیہ کالج۔ لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۵ء

قیمت چار روپیہ

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

فون نمبر ۴۵۵۹

ناشر:- عزیز الرحمٰن (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) پرنٹر یونائیٹڈ انڈیا پریس

انتساب

میں اس تصنیف کو

اپنے برادر معظم مولوی سید احمد حسین صاحب مرحوم

پروفیسر جوبلی کالج کے نام معنون کرتا ہوں جن کی

"تربیت سے جس کی میں انجم کا ہم قسمت ہوا"

مرتضیٰ حسین موسوی

SYNOPSIS OF THE DRAMA

مشاعرۂ عالم ارواح کی خصوصیتیں

۱۔ تاریخ ادب اردو اور تنقید کلام یکجا جمع کر دی گئی

ابتک تاریخ و تنقید الگ الگ کتابوں میں تھی ایک ہی مقام پر دونوں کا جمع ہونا مشکل تھا طالب علموں کو مختلف تاریخ اور تنقید کی کتابوں سے فراہم کرنا ہوتا تھا۔ میں نے تمام تاریخوں، تذکروں اور نثر کی کتابوں سے اور مستند تنقیدوں سے اخذ کر کے ایک ہی مقام پر ان سب چیزوں کو اس میں جمع کر دیا ہے۔

ہر صدی کے مختلف حصوں میں جو تغیرات زبان۔ محاورات تخیل ۔ طرز شاعری میں واقع ہوئے ہیں ان سب کا تدریجاً اظہار۔

تمام شعراء کو اس مشاعرے میں اُسی ترتیب سے CHRONOLOGICAL ORDER یا میں بٹھایا گیا ہے جس سلسلہ میں انھوں نے انتقال کیا۔ تاکہ تدریجی ارتقاء ادب و شاعری کا پورے طور پر اظہار ہو سکے۔

نظم کے ساتھ نثر کا ارتقائے تدریجی۔

اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ہر دور میں جو نثر میں بطور گفتگو یا روزمرہ کے رائج تھی وہ بصورت مکالمہ ظاہر کر دی گئی ہے، یہ چیز کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں مل سکتی، صرف علیحدہ علیحدہ الفاظ جو اس زمانہ میں رائج تھے ملتے ہیں، ان الفاظ

سے جملے بنا کر اس کتاب میں (DIALOGUE) گفتگو مرتب کی گئی ہے۔ مثلاً ولی سنہ ۱۷۴۳ء کی رائج بولی میں گفتگو کرتے ہیں اور میر سنہ ۱۸۱۰ء کی زبان میں۔ یا نظیر سنہ ۱۸۴۰ء کی بولی میں اور حالی سنہ ۱۹۲۰ء کی زبان میں۔ اسی طرح آٹھ DIALOGUE ہیں جن میں اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ان کے کردار، ماحول اور خیالات کی پوری پوری عکاسی کی جائے۔

۴- CULTURAL HISTORY تہذیب و شائستگی کا ارتقاء

ہر حصۂ صدی کے تمدن اور معاشرتی حالات میں جو جو تغیرات ہوئے ہیں جس سے ان کا کلام متاثر ہے ان کو ظاہر کیا گیا ہے بذریعہ شعراء کے لباس، وضع وقطع، خط و خال، رفتار و گفتار یہ مختصر واقعات زندگی جن کا اثر خیالات پر پڑنے سے کلام متاثر ہوا۔

۵- ہر شاعر کی خصوصیات اور اس کے کلام پر مستند تنقید۔

ہر شاعر کے پڑھنے کے بعد آزاد یا شبلی تعریف کے سلسلہ میں اُن بیانات کا خلاصہ جو نقادوں نے اس شاعر کے کلام پر کیا ہے، مع ان خصوصیتوں کے جو اس کے کلام میں ہیں بیان کر دیے ہیں۔ یہ مستند اقوال ہیں مختلف نقادوں کے۔

۶- ترقی پذیر اصناف کلام کا بہترین نمونہ۔

فقط غزل ہی پر اکتفا نہیں ہے۔ بلکہ غزل کے ساتھ ریختی، مستزاد، قصیدہ رباعی، قطعہ، سلام، مرثیہ، مثنوی، جدید نظمیں (سیاسی، معاشرتی، و مناظر قدرتی) لیکن سب معیاری، خاص کر وہ جس سے ہر شاعر کی شاعرانہ کاوشیں اپنے اپنے دور میں تدریجی طور پر ظاہر ہوں جمع کر دی گئی ہیں۔

۷۔ دیباچہ میں ڈراما کی مختصر تاریخ اور افادیت پر سیر حاصل بحث۔

اس میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ اگلے زمانہ میں (SUPER HUMAN) مافوق البشر کو مثنوی اور ڈراما میں بہت اہمیت تھی اور اب فی الحال مافوق البشر سے اجتناب کیا جاتا ہے چنانچہ اس مشاعرہ عالم ارواح میں تمام شاعروں کو زندہ جیتا جاگتا (HUMANISE) کر کے پیش کیا گیا ہے پورے ڈراما میں کہیں بشری حالت کے خلاف کچھ نہیں ہے۔

۸۔ COMIC یعنی خوش طبعی کی نظم میں ادبیت کا لحاظ

ہزلیات میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اعلیٰ ادبیت کے ساتھ ہزل و جد کا نمونہ دکھا جائے، چنانچہ اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی کا کلام رکھا گیا ہے۔ جس میں ادبیت کا اعلیٰ معیار قائم ہے اور مزاح بھی نہایت شستہ و شائستہ ہے۔

۹۔ تین سو برس میں گذرنے والے اول درجہ کے بیالیس شعراء کا معیاری کلام معہ گفتگوئے نثر۔

۱۶۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک کے تمام صاحب طرز شعراء کا ہر صنف کا معیاری کلام اس طور پر پیش کیا گیا ہے کہ تقریباً جتنی مستند کتابیں تاریخ ادب، تذکرہ اور تنقید کی، اس وقت تک چھپ چکی ہیں، سب کا خلاصہ اس شاعر کی بابت یکجا جمع کر دیا گیا ہے اور اس کے زمانہ کی نثری گفتگو کے نمونے دکھا دیے ہیں کہ طالب علموں کو متعدد کتابوں میں ڈھونڈنا نہ پڑے،

۱۰۔ مفید ضمیمے۔

ڈراما کے ختم پر چند ضروری ضمیمے بڑھا دیے گئے ہیں، مثلاً:۔

(۱) لائحہ اوقات (TIME CHART) پیدائش و وفات شعرا جو شریک مشاعرہ ہیں۔

(۲) خاکۂ نشست (SEATING ARRENGEMENT)

(۳) ہر صنف کلام پر تنقیدی نوٹ اس کی تدریجی ترقی، اس کی افادیت وغیرہ۔

(۴) ہر دور کے شعراء اور اس دور کی خصوصیت۔

(۵) ہر شاعر کی انفرادی خصوصیت اور اس کا اضافہ اس صنف میں۔

(۶) ہر شاعر کے اسٹیج پر آتے وقت اس کے نام کے اعلان کے واسطے اسی کا مقطع، جن شعراء کا تخلص ہی نہ تھا ان کے کلام سے ایسا شعر ڈھونڈھ کر دیتا گیا ہے جس میں "حسن بندش" سے ان کے نام کی طرف اشارہ ہو۔

فہرست مضامین

فہرست ضمیمہ جات
مشاعرہ عالم ارواح

ضمیمہ اوّل۔

پیش لفظ

(پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب)

انسان پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، کوئی کار نمایاں کر کے مرتے ہیں تو مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے اور ہمارے خوابوں اور خیالوں میں طرح طرح سے آتے رہتے ہیں، ہماری یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ انھیں صرف ان کے کارناموں میں زندہ نہ دیکھیں بلکہ ہو سکے تو گوشت پوست میں اپنی ہی طرح چلتا پھرتا دیکھیں، ان سے ملیں، باتیں کریں، اپنی کہیں اور ان کی سنیں، کیوں کہ ہر شخص اپنی عزیز چیزوں سے زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنا چاہتا ہے، انسانوں نے اپنی یہ خواہش طرح طرح سے پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ جسموں کو مٹی میں ملنے سے بچانے کے لئے مصریوں نے میتوں اور نعشوں کو ممی میں تبدیل کر لیا تاکہ جب چاہیں انھیں دیکھ سکیں، کچھ لوگ اپنے پسندیدہ لوگوں کی شبیہیں اور قلمی تصویریں تیار کر لیتے ہیں کہ ان کی نقل ہی سے جی بہلائیں، ہمارے بزرگ اور پیش رو کس طرح باتیں کرتے تھے، کیسے اٹھتے بیٹھتے تھے، شعر و سخن کی محفلیں کس طرح آراستہ کرتے تھے اور زبان و ادب کی خدمت میں کس طرح سے منہمک رہتے تھے یہ باتیں جاننے، دیکھنے اور سننے کی پیاس ہر دل میں پیدا ہوتی ہے چنانچہ تاریخوں تذکروں اور دوسری تحریروں میں جب ایسی چیزیں نظر آجاتی ہیں تو وہ صرف

ہمارے علم میں اضافہ نہیں کرتیں ہمیں خوشی بھی بخشتی ہیں۔

جہاں تک اُردو شعراء کو اس طرح زندہ کرنے کا تعلق ہے، میرا خیال ہے اس کی پہلی کامیاب کوشش مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں کی تھی۔ اسے پڑھ کر کتنے مناظر، معرکوں، مشاعروں اور صحبتوں کی تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ پھر اور کوششیں بھی ہوئیں جن میں ادبی حیثیت سے سب سے زیادہ کامیاب، دل کش اور یادگار مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا دلّی کا یادگار مشاعرہ" ہے۔ جسے حُسنِ بیان اور واقعیت کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، اسی انداز پر "لکھنؤ کا ایک یادگار مشاعرہ" بھی کاغذ کے صفحات پر منعقد کیا گیا ہے لیکن وہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک بھونڈی نقل ہو کر رہ گیا ہے، ڈاکٹر ناموس نے ایک مشاعرہ عالم بالا میں قائم کیا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے مختصر تمثیلیں اسی انداز کی لکھی ہیں۔ زیرِ نظر تمثیل اسی سلسلہ کی ایک نئی اور خوبصورت کڑی ہے جسے مرتضیٰ حسین موسوی نے ترتیب دے کر تخئیل کی جولانیاں دکھائی ہیں، چوں کہ ڈراما اس طرح کی خیال آرائی کے لئے سب سے زیادہ موزوں صنف ہے اس لئے موصوف نے اپنے مقصد کے لئے اسی کو منتخب کیا ہے۔

قوتِ متخیلہ جب حقائق کی بنیاد پر عمل پیرا ہوتی ہے تو چاہے اس میں بہت انوکھاپن نہ ہو لیکن سچ سے پیدا ہونے والی دل کشی ضرور ہوتی ہے اس تمثیل کی بنیاد بھی تاریخی حقائق پر رکھی گئی ہے اور تخئیل سے کام لینے میں اسکا لحاظ رکھا گیا ہے کہ جس کردار کی جو خصوصیت ہے وہ زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو، ایک حیثیت سے یہ اُردو شاعری کی مختصر تاریخ ہے جس میں تین سو سال کے شعری ادب کا جائزہ

لیا گیا ہے، یہ جائزہ مثالوں کی فراوانی سے زیادہ سے زیادہ مفید بن گیا ہے، آزاد حالی، شبلی اور فرحت اللہ بیگ کے شامل کر لینے کی وجہ سے نہ صرف اس تمثیل کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے، بلکہ تنقیدی حیثیت سے اردو شاعری کی بہت سی خصوصیات بھی نمایاں ہو گئی ہیں۔

یہ مشاعرہ ڈرامہ کے طرز پر ترتیب دیا گیا ہے اس لئے اس میں مکالمہ کا جزو کافی ہے لیکن ضرورت کے لحاظ سے درمیان میں ایسی باتوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے جن سے اردو شاعری کے ارتقاء، زبان کے تغیرات اور شعرا کی انفرادی خصوصیات کے سمجھنے میں مدد مل سکے، اس مشاعرہ میں صرف بیالیس شعرا شریک ہیں لیکن یہ وہ شعرا ہیں جن سے اردو زبان کا وقار قائم ہے اور یہ مختلف اصناف سخن کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ گو ان کا زمانہ ایک نہیں ہے لیکن مصنف نے ان کو ایک ایسی جگہ پر جمع کیا ہے جہاں زمان و مکان کا فصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن اس سے یہ نہیں ہوا ہے کہ ایک ہی جگہ پہونچ جائے، ایک ہی ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان کی انفرادی اور امتیازی خصوصیتیں مٹ گئی ہیں بلکہ واقعیت پیدا کرنے اور دیکھنے یا پڑھنے والوں کی نظروں میں حقیقی بنانے کے لئے انھیں اپنے ہی لباس وجھ دیں پیش کیا گیا ہے، شعراء کی وضع قطع، رفتار، گفتار اور لب و لہجہ کے انداز سے اس ماحول کی عکاسی ہو جاتی ہے جس سے ان کا تعلق ہے اور اظہار خیال سے افتاد طبایع کا فرق معلوم ہو جاتا ہے، اس طرح بہ یک وقت ہمیں شاعر اور اس کی شاعری دونوں کے متعلق اہم باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، ڈرامہ کے

دوران میں جن ضروری باتوں کے اظہار کا موقع نہیں تھا انھیں ضمیمہ میں اکٹھا کر دیا گیا ہے اور اس طرح کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ شعراء کی افادیت اور پیدائش کا چارٹ بھی بہ یک نظر ان کے عہد اور انکی عمر کا پتہ دیدیتا ہے میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی مدد سے اردو شاعری کی تاریخ کے یاد رکھنے اور اس سے دل چسپی لینے میں بڑی مدد ملے گی اور طلباء کا ذوق ان شعراء کے متعلق اور باتیں جاننے کے لئے بےچین ہو گا مرتضیٰ حسین صاحب کی کوشش اور کاوش قابل تحسین ہے کیوں کہ شعراء کی یہ زندہ تصویریں، اُن کے کلام کے اعلیٰ نمونے اور ان کے حالات ایک ہی جگہ پر کہیں اور مشکل ہی سے ملیں گے اور اسکے لئے یقیناً انھیں بہت سی کتابوں کو کھنگالنا اور بہت وقت صرف کرنا پڑا ہو گا۔

اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ یہ تمثیل صرف مفید ہی نہیں ہے بلکہ دل چسپ بھی ہے۔ جیسا دل کش موضوع تھا موصوف نے اسے ویسے ہی دل کش اور شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسی معلومات اور ایسا مواد جب تک متاثر کر دینے والے انداز میں پیش نہ ہو اس کی افادیت بھی بہت کم ہو جاتی ہے لیکن مصنف نے اسکا بہت لحاظ رکھا ہے کہ لطف ہر جگہ برقرار رہے اور اس میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو نہ صرف طلباء اپنے ذوق اور مطالعہ کے لئے مفید پائیں گے بلکہ اہل نظر بھی مصنف کی محنت اور کاوش کی داد دیں گے۔

باسمہٖ سبحانہٗ

دیباچہ

اگر یہ کہا جائے کہ "انسان حیوان نقال ہے۔" تو اہلِ منطق فوراً اعتراض کر دینگے کہ یہ تعریف نہ جامع ہے نہ مانع۔ مگر ہاں مسئلہ "ارتقا" کے زبردست حامی گاردیح ضرور خوش ہوں گے کہ ان کی تائید ہو گئی اور زنجیرِ ارتقا کے حلقۂ گم شدہ تک انسان کو پہونچا دیا لیکن نکتہ شناس آنکھیں پہچانتی ہیں کہ نقل، پیروی، تشبیہہ، تمثیل، تقلید تتبع، توارد اور توازن میں کیا کیا باریک فرق ہیں یہاں ان مترادفات کی لغوی توضیح مدِ نظر نہیں ہے بلکہ ان سب کی افادیت پر مبصرانہ دعوتِ نظر ہے۔

بزرگ پیشروانِ وادیٔ ادب کے نقشِ قدم رکھنے والی راہ کے متوازی ایک نیا راستہ بنانا سعادتِ دارین کی منزل تک پہونچنے کی سبیل ہے۔ ؎

"سعادت ہے بزرگانِ سلف کی پیروی کرنا"

بادی النظر میں یہ چاہے جتنا سہل راستہ سمجھا جائے لیکن حقیقتاً بہت دشوار گزار راہ ہے۔ اس میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا ہے کہ پیشروانِ راہِ عدم کے نقشِ پا "ریگِ زمانہ" پر اور اُجاگر ہو کر گم گشتگانِ جادۂ ادب کے واسطے چراغِ ہدایت بن جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وقت کے "سیلِ گریزاں"

نے اگلے زمانے والوں کے پاؤں کو لگے ہوئے وہ راستے جن کو اب پاٹ کر مسدود کر دیا ہے اس دور میں اُن پگڈنڈیوں کے بجائے ایسی نئی نئی راہیں کیونکر نکالی جائیں کہ راہ روانِ جادۂ ادب ان پر گامزن ہو کر اب نہ بھٹکنے پائیں۔

یونان کے حکمائے مشائین نے تلقین دین اور ہدایت اصول اخلاق کی راہیں نکالیں، وہ کچھ ایسی سوچی سمجھی پگڈنڈیاں بنا گئے کہ عوام الناس کو ہمیشہ ان ہی راستوں پر چلایا گیا۔ کسی نظری اصول کو عملی جامہ پہنانا وہ پر تاثیر طریقہ تھا جس نے پیچیدہ سے پیچیدہ مبحث کو دل نشین ہونے میں ہمیشہ مدد کی اس سرزمین علم و حکمت سے تمثیل (DRAMA) ڈرامانے نکل کر وہ منارۂ روشن تعمیر کر دیا جس کی روشنی میں نظریات کی کشتیاں ساحلِ عمل تک پہونچ سکیں، مذہبی نظریے اور اخلاقی مسئلے اسی تمثیل نے روشن و واضح کئے۔ علم و حکمت کے اصول ادب اور زبان دانی کے پیچیدہ مباحث بھی اسی سے صاف و واضح کئے گئے، تعلیمی دنیا میں اس وقت بھی توضیح بالعمل (DIRECT METHOD) وہ مؤثر طریقہ ہے جو "لفظ" کو "عمل" بنا کر ذہن نشین کر دیتا ہے۔ تمثیل کا پر تاثیر مو قلم نازک ذہنی مسائل کا پرکار نقش فہم کی ان گہرائیوں میں بنا آتا ہے جہاں تک زبان کی حرکت سے پیدا کئے ہوئے امواج ہوا پہنچنے سے قاصر ہیں۔

مذہب کی مقدس بارگاہ میں "اقرار باللسان" بھی "تصدیق بالجنان" کے مرتبۂ کمال تک رسائی حاصل کرنے کے لئے خود "عمل بالارکان" کا محتاج رہتا ہے، دنیا خود دارالعمل ہے، یہاں عمل یا حرکت سے برکت ہے۔ اس پیکر آب و گِل میں اگر حرکت عمل نہیں تو وہ ایک جسم مردہ ہے، ہمارا کرۂ خاکی جس پر ہم آپ آباد ہیں، خود

نظام شمسی کا ایک اداکار بھی ہے اور بجائے خود ایک مصطبہ (STAGE) اسٹیج بھی ہے جس پر افراد انسانی اپنا اپنا پارٹ کھیل کر کامیابی سند یا ناکامی کا الزام لئے کتم عدم میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں سے برسوں بعد پھر ان کو جسم مثالی کا لباس پہن کر جنت کی نعمتیں پانے یا دوزخ کی تکلیفیں اٹھانے جانا پڑتا ہے۔

خود ہمارے افعال ارادی نام کو ہمارے ارادے کے مطیع ہیں حالانکہ وہ سب حقیقتاً نقل ہیں ان افعال کی جو ہم نے وراثتاً والدین سے سیکھے یا ہماری جنس و نوع کے افعال و کردار کی تقلیدیں ہیں ہم زندگی میں نقل سے بچ ہی نہیں سکتے دنیا سے تشبیہہ و تمثیل اگر فنا کر دی جائے تو انسان ایک پیکر بے روح بن جاتا ہے محض تمثیل و تقلید آدمی کو "انسان" بنائے ہوئے ہے۔ تمثیل کے ذریعہ سے وہ وہ چیزیں ذہن نشین ہوتی ہیں جو فہم و فراست انسانی سرحد سے کوسوں دور ہیں۔ فرشتوں تک کو انسان نے اسی وقت پہچانا جب وہ مجسّم ہو کر آدمی کے سامنے آئے ملک کو بھی اپنی "مافوق البشری" قوتوں کو سمجھانے کے لئے تمثیل ہی کا لباس پہننا پڑا۔

قابل انساں کی صحبت کے ہے انساں نہ ملک

بن گیا مثل بنی صورت دحیہ جبریل (ذوق)

فرشتوں کا وجود۔ دیوتاؤں کا عقیدہ۔ رب النوع (GOD) سے غضب و ترحم کی توقع یہ سب ذہنی اور نظری باتیں تھیں جن پر یقین رکھنا اور جن سے لو لگانا بطور عقیدہ ضروری تھا، مذہب کے دیدبان نے یہ خبر دی تھی کہ بزرگان دین کے دربار میں فرشتے ہیکل انسانی میں آتے ہیں۔ اسی عقیدے کی بنا پر استادان اخلاق و آداب

نے تمثیل میں مافوق البشر (SUPER HUMAN) کا اضافہ لازم و واجب قرار دیا تھا۔ اگلے زمانہ میں جب تک مذہب پر مادیت کا غبار نہیں پڑا تھا تو حصول مذہب کی تعلیم و تلقین کے لئے اعجازی تمثیل (MIRACLE PLAY) کو خوب رواج ہوا۔ اس اعجازی تمثیل نے تمام ذہنی اور نظری مسائل کو عین الیقین بنا کر دکھا دیا، مشرق سے مغرب تک ہر ہر گوشے میں جہاں جہاں تمثیل نویس تھے یہ نظریہ عام ہو گیا، علم الاصنام (MYTHOLOGY) کے پرستاروں نے اپنے اپنے عقیدے کے بموجب ان کی شکل و شمائل، خال و خط، لباس و وضع اور دیگر سامانِ آرائش فراہم کئے یہ طرز ایسا دل پذیر ہوا کہ بغیر "مافوق البشر" کے کوئی تمثیل کارگر نہ ہوتی تھی، یہاں تک کہ داستانوں اور مثنویوں میں بھی ہمیشہ مافوق البشر ہی نے بہت کچھ کام دکھایا، مولانا آزاد نے آبِ حیات کے جام بھر بھر کے اگلے ادیبوں کو پلائے مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ اس آبِ بقا کی تاثیر سے فقط مرنے والوں کے نام ہی زندہ ہو سکے اور ان کے جسموں میں کوئی حرکت جو حیات کا ثبوت دیتی نہ پیدا ہوئی تو بالآخر "نیرنگ خیال" کے ذریعہ سے فرشتۂ رحمت کی مدد لی، اس مافوق البشر قوت نے ان بوسیدہ ہڈیوں میں ایسی طاقت پیدا کر دی کہ وہ شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی اپنی کرسیوں پر جا بیٹھے۔

ملکوتی طاقتیں، جناتی قوتیں کبھی پرستانوں کی سیر کراتی تھیں اور کبھی کوہ قاف کی حسین و دوشیزہ پریوں کا دیدار کرا دیتی تھیں لیکن ان کی گفتگو میں شعریت اور ادبیت چاہے جس حد تک ہو مگر اصلیت اور حقیقت اور مذاقِ سلیم کی پسندیدہ نتیجہ خیز تکلم کی اصلی روح کا فقدان ہی رہا۔ کردار نگاری، جیتے جاگتے انسانوں کی

نتیجہ خیز گفتگو جس سے نہ صرف افکار رجحان طبع بلکہ ان کا ضمیر اور مافی الضمیر بھی ظاہر ہو سکے یا ایسے مکالمے جن سے ان کی روزمرہ کی زندگی اور انکے کردار کی بھی عکاسی بھی ہوتی ہو اس سے ان کی تمثیلیں ہمیشہ اس واسطے خالی رہیں کہ وہ عہد اشارات تھا (AGE OF SYMBOLISM) عہد نعرہ زنی (AGE OF SOLAGON) نہ تھا۔

یہ عہد گزرا اور زمانہ اپنی گردشوں سے اُس نقطہ تک پہونچا جہاں پر انسان نے پانی اور ہوا تک کو اپنا مطیع بنا لیا، برقی پوشیدہ لہریں اس کے قابو میں آگئیں عالم اسباب و علل و استنباط کا عمل دخل اور حکمرانی ہونے لگی، ہر ایک چیز کی اصلیت کھلی اس کے مختلف حالات اور کیفیات معلوم ہونے لگے۔ انسان کے "علم الاسماء" میں اضافہ ہوا۔ اب آدمی محفل مخلوقات میں مسند شرافت پر صحیح طور سے متمکن ہوا۔ تو اس کے دربار میں "بشر" کا وہ اعلیٰ مرتبہ ہو گیا کہ اس سے بالاتر کسی کی ہستی ہی نہ رہی، اب "بشر" سے کوئی مافوق ہی نہ تھا کہ اس کی مدد کرتا، اب اس کی بارگاہ تک مافوق البشر کی رسائی ناممکن ہو گئی، انسان کے نفسِ ناطقہ کی صحیح عزت و آبرو نے اس کی "زبان" اور اس کے "قول" کو اتنا ممتاز کر دیا کہ جو لفظ اس کے مُنھ سے نکلا وہ جواہرات سے زیادہ قیمتی اور پرضیا تھا اب انسانوں کا مکالمہ مافوق البشر سے زیادہ فوقیت پانے لگا، اس نئی قوت مکالمہ نے مُردوں کو زندہ کر دیا، حیوانوں کو انسان بنا دیا اور دور افتادہ لوگوں کو ایک جا جمع کر دیا۔ انکی ذہنی استعداد نے بعدِ مکاں اور بعد زماں کا فرق مٹا دیا اب وہ دور آیا کہ وہی مافوق البشر جس کے سامنے کبھی "بشر" سرِ تسلیم خم کرتا تھا اب اگر وہی

"بشر" بن کے آئے تو اس کی بات پوچھی جائے ورنہ اس کی طرف نظرِ التفات بھی نہ ہو۔

لائقِ مجلس ملک کب ہے کہ ہے وہ غیر جنس
صورت دحیہ میں جبریل امیں ہوں کامیاب (مولف)

اسی خیال سے متاثر ہو کر مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے ایک تمثیلی مشاعرہ "دہلی کی آخری شمع" کی روشنی میں قائم کیا، لیکن وہ صرف ایک ہی عہد اور ایک ہی زمانہ کے معاصر مشہور و غیر معروف اور ایک ہی شہر کے باشندے شعراء کو مدعو کر سکے۔ موجودہ زیرِ نظر" ایک مجلسی تمثیلی مشاعرۂ عالم ارواح "میں موجودہ عہد ایجادات و انکشافات کا مشاعرہ پیش کیا ہے وہ اس زمانے کی محفل ہے جبکہ وقت اور مسافت کی دوری سائنس اور ریڈیائی اثرات مٹا سکتے ہیں جب انسان کی زبان میں اتنی گویائی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کا لباس اور عمل کا جامہ پہنا سکتا ہے، جب اس کے ذہن کی رسائی ان بلندیوں تک ہو سکتی ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جل جاتے ہیں۔ جب اس کی نظر ان گہرائیوں تک کام کر سکتی ہے جہاں سورج کی آب و زرکرنیں روشنی نہیں ڈال سکتیں، جب اس کی سماعت کوسوں دور کی باتیں سن سکتی ہے۔ جب اس کی آنکھیں گوشت و پوست کے غلاف میں ڈھکی ہوئی ہڈیوں کے مغز تک کو دیکھ سکتی ہے، اسوقت مافوق البشر کی ہستی تمثیل میں بے اصل و بے کار سمجھی جانے لگی ہے۔ اس عہد میں انسان کے سامنے دنیا نے اپنے پوشیدہ خزانے کو آئینہ کی طرح روبرو رکھ دیا ہے سربستہ رازوں کو منظرِ عام پر پیش کر دیا ہے۔ قدیم ایام کے مرقعے جنکو عہدِ پارینہ

نے کتم عدم میں چھپا کے "نقش و نگار طاق نسیاں" بنا دیا تھا، پھر منظر عام پر بہ ہزار رنگینی و تازگی "صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے"۔ دیدہ زیبی کر رہے ہیں وہ قوت نطق جس نے حیوانوں کو آدمی کیا بلکہ "انسان بنا دیا" اب اپنے پرکار جلوے پوری آب و تاب سے دکھا رہی ہے، اب صرف مکالمہ ہی تمثیل کا وہ جزو سمجھا جاتا ہے جس سے اس کو پرکھ کر اس کی اصلی قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر اس "ایک مجلسی تمثیل مشاعرۂ عالم ارواح" میں کسی مقام پر مافوق البشرے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ مقدس اور پاک روحوں کو بقول حافظ شیرازی ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

زندۂ جاوید مان کر جامۂ ہستی میں جیتے جاگتے انسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جس شاعر نے اپنی تمام عمر جس کار خیر میں صرف کی ہے اس کو اسی صورت میں وہی عمل کرتے دکھایا ہے۔ یعنی محض شاعروں کو ان کی آخر عمر کی حالت مدنظر رکھ کر منظر عام پر اسی صورت میں پیش کیا ہے مثلاً جو شاعر اپنی زندگی میں اوراد و وظائف کا ملتزم تھا یہاں بھی مثل عادت کے جس کو طبیعت ثانیہ کہتے ہیں اسی کار خیر میں مشغول نظر آئے گا۔ گو کہ عالم ارواح دار العمل نہیں ہے مگر یہاں تو محض شعرا کو عالم اسباب سے اٹھنے کے قریب تر وقت کی حالت میں ظاہر کرنا اصل مقصد ہے، لیکن فقط جو اس مشاعرے میں بہ صورت منتظمین دکھائے گئے ہیں انکو اس عہد کی صورت میں دکھایا ہے جب کہ ان کی تنقید دنیا کے سامنے پیش ہوئی تھی۔

مذہب کا مقدس رہنما بتا چکا ہے کہ برزخ نام ہے اس عہد طویل کا جس میں روحیں اپنے اپنے جسموں سے علیحدگی اختیار کر کے اسی کرۂ خاکی کے کسی نامعلوم مقام پر منتظر رہیں گی اس وقتِ معلق کی جب ہنگامۂ حشر و نشر برپا ہو جس کے ختم ہونے پر وہ اپنے اپنے اعمال و افعال کا جائزہ دے کر دوسرے عالم میں مختلف مقامات و مساکن میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو جائیں گی۔ اسی واسطے یہ مشاعرہ اسی عالم برزخ میں کر لیا گیا ہو کہ وقت معہود کے بعد یہ سب مختلف باغوں، قصروں اور محلوں میں منتقل ہو جائیں گے پھر کیا خبر کہ آپس میں یکجائی و ملاقات بہ سہولت ہو سکے یا دقتیں درپیش ہوں۔

دمِ صحبت غنیمت دان و دادِ خوش دلی بستاں
بسے گردش کند گردوں بسے لیل و نہار آمد (حافظ)

اس محفل مشاعرہ میں سامعین نظر نہیں آئیں گے اول وجہ تو اس کی یہ ہے کہ اگلے زمانے کے مشاعروں میں "سامعین" ہوتے ہی نہ تھے، اور اگر چند چیدہ چیدہ اہل علم و ادب ہوئے بھی تو وہ بہت کم صرف ایسے لوگ جنکو شاعری کا ذوق بھی ہو اور فنِ شعر سے علماً پوری پوری واقفیت بھی رکھتے ہوں۔ ان کا مذاق سلیم اس حد پر مسلّم ہوتا تھا کہ وہ "شاعر گر" کہلاتے تھے خاموش بیٹھے اور گوشِ نقد سے سنتے تھے چشم تبصرہ سے دیکھتے اسی واسطے تو مشہور ہے کہ ع

"تعریف ناشناس و سکوت سخن شناس"

دوسری وجہ اس مشاعرے میں سامعین کے موجود نہ ہونے کی یہ ہے کہ یہاں کے سامعین حقیقت میں عالم اسباب کے باشندے ہیں جن کے مذاق سلیم

کے سدھارنے کے واسطے یہ مشاعرہ منعقد کیا گیا ہے اس مشاعرے کے ذاکرین کی آواز ریڈیو کے اصول پر فضائے عالم میں نشر ہو جائے گی اور عالم اسباب والے اپنے اپنے مقام پر بیٹھ کر سُن لیں گے اسی واسطے سامعین کی سہولت کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ بعد ادائے فریضۂ مغرب مشاعرہ شروع ہوتا ہے اور ادائے فریضۂ عشاء کے فضیلت کے وقت وقفہ (INTERVAL) ہوتا ہے۔

اس مشاعرے میں انسانوں کی روح "مبشر" بن کر آدمیت کے لباس میں انسان کی سی باتیں کرتی ہے اور کسی فرشتے، ملک یا دیوتا کی اعانت کے بغیر اپنے اسی شغل کا جس میں پوری عمر دنیا کی زندگی میں بسر کی تھی اپنی ذات خاص سے خود باحسن اسلوب عملاً مظاہرہ کرتی ہے۔

اس تمثیل میں مکالمہ یا گفتگو اسی واسطے رکھی گئی ہے کہ شعراء کے اشعار سے ان کے عہد کی نظمی کاوشیں جس طرح ظاہر ہوتی ہیں اسی طرح ان کے عہد کی وہ زبان جو ملک میں اس وقت رائج تھی جب کہ وہ زندہ تھے ان کی نظمی خدمت کے ساتھ ہی ساتھ ظاہر ہو سکے۔

تمام شعراء اُسی لباس اور اُسی صورت وحالت میں دکھائی دیں گے، جس پوشاک اور جس ہیئت سے وہ عالم آب و گل سے رخصت ہوئے اور اسی بولی میں گفتگو کریں گے جو ان کے عہد میں رائج تھی اور جس کو بولتے ہوئے وہ مرے۔ جس طرح ان کا کلام ان کے عہد بہ عہد کی شاعرانہ خدمتوں کو واضح کر رہا ہے اسی طرح انکا مکالمہ ان کے ہر دور کی نثر کا آئینہ دار ہے، ساتھ ہی ساتھ انکے لباس سے انکی وضع قطع ان کے زمانے کا طرز معاشرت اور اصول زندگی کی وضاحت ہوتی

ہے ناقدین جو بہ صورت منتظمین مشاعرہ دکھائے گئے ہیں ان کی صورت اس عہد کی شبیہ ہے جب کہ ان کی تنقید دنیا کے سامنے پیش ہوئی تھی۔

جس طرح خیالات ماحول کے مطیع ہوتے ہیں۔ اسی طرح جذبات معاشرت اور حیثیت کے آئینہ دار بنتے ہیں۔ وضع اور لباس، معاشرت و تمدن اور طرز زندگی کی مختلف منزلوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس تمثیل میں شعراء کو اسی ترتیب سے نہایت کدو کاوش کے ساتھ بٹھایا گیا ہے جس طرح اور جس ترتیب سے انھوں نے مادی زندگی سے نجات پائی ہے۔ تاکہ ان کا کلام ان کی شاعرانہ کاوشوں کا پورا پورا حال اس عہد خاص میں ظاہر کر دے۔

یہ بتانے کے لئے کہ انھوں نے زبان اور شاعری میں کیا کیا جدتیں، کاوشیں اور اضافے کئے ان کے طرز خاص کو آئینہ کر دینے والا کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مشاعرہ "بے طرح" منعقد کیا گیا ہے تاریخی نقطۂ نظر سے شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ کرنے والوں کے واسطے ایک لائحۂ اوقات (TIME CHART) بنا دیا گیا ہے کہ ہر شاعر کا عہد اور اس کے معاصرین کے زمانہ کا پتہ چل سکے اور اس عہد میں اس فرد خاص نے جو اضافہ شاعری اور زبان دانی میں کیا ہے ظاہر ہو سکے۔

درس و تدریس سے تعلق رکھنے والوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے چند ضروری ضمیمے فراہم کر دے گئے ہیں کہ تعلیمی نقطۂ نظر (ACODEMIC POINT OF VIEW) سے کتاب کی افادیت بڑھ جائے اور طلباء و تلامذہ میں تمثیل کے پڑھنے سے صحیح مذاق شعر پیدا ہو سکے۔

یہاں تین شخص ایسے ملیں گے جو بہ حیثیت مہتمم اور منتظم کے دکھائی دیں گے

(یہ حقیقتاً نقاد ہیں ان کو اس عہد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جب انکی لکھی ہوئی تنقید دنیا کے سامنے آئی) ان لوگوں نے اپنی زندگی میں جو خدمت زبان اور ادب کے ساتھ کی اس کا اعتراف اس صورت کے علاوہ ہو ہی کیا سکتا تھا کہ جس طرح کل دنیا میں ان کے قلم کی تنقید نے ان شاعروں کا ہم سے تعارف کرایا جنکو گزرے ہوئے ایک عرصۂ دراز ہوا آج وہ پھر عالم ارواح کے اس مشاعرے میں ہم کو ان کا صورت آشنا بنائیں۔

دو بادشاہان دنیا بھی اس مشاعرے میں شریک کئے گئے ہیں اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ لکھنؤ اور دہلی ہی دو مرکز زبان تھے جہاں کی ٹکسال کا سکہ ملک شاعری میں رائج تھا، دوسرے یہ کہ ان دونوں کلچر (CULTURE) تہذیب و شائستگی کے مرکزوں کے لباس و وضع میں جو فرق تھا وہ بھی ان ہی کی ذات سے نمایاں ہو جائے گا۔ تیسرے یہ کہ یہی دونوں ایسے بادشاہ تھے جنھوں نے ملک کے امن و تہذیب و شائستگی کے تحفظ کی غرض سے آزادی کی پہلی لڑائی میں دستِ برد زمانہ کی تکلیفیں اپنی ذات پر انگیز لیں اور رعایا کو بدامنی اور بربادی سے بچایا۔ یہ اپنے عہد سلطنت میں نہ فقط شاعروں کے مربّی ہی تھے بلکہ خود بھی شاعری کی خدمت اپنے کلام سے کرتے تھے۔ گو کسی خاص طرز کے مالک نہ تھے اور ان کا کلام کلام الملوک سے زیادہ آگے بڑھ بھی نہ سکا۔

یہ بھی ان کے ذریعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے علم دوست بادشاہ کمال اور ہنر کے ایسے قدردان تھے کہ جب وہ کسی فن کے باکمالوں میں آ بیٹھتے تو اپنی ملوکانہ شان و شوکت کا ذرہ برابر خیال نہ کرتے تھے اور نہ ایسی محفل میں اپنا امتیاز

ہی چاہتے تھے۔

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل　　بادشہ تخت سے یاں آ کے اتر لیتا ہے

اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر دور کے شاعر نے جس خاص صنفِ نظم کو درجۂ کمال تک پہنچایا اسی کو وہ اپنی باری پر اس تمثیلی مشاعرے میں پیش کرے یہ خیال ہرگز نہیں ہے کہ تمام اصنافِ کلام خواہ مخواہ اس میں ٹھونس ہی دیے جائیں، اگر یہ مدنظر ہوتا تو بہت سے اہم اصناف کلام کو کیوں ترک کیا جاتا۔

جتنا حصہ اس تمثیل کا اداکاری کے طور پر اسٹیج پر ظاہر کرنے کا ہے وہ قریب قریب اتنا ہی ہے جو بخوبی ۲½ گھنٹہ میں دکھایا جا سکتا ہے اور جس میں اپنی پسند و سہولت اداکاری کے لحاظ سے کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔ مثلاً تعداد شعرا یا اصناف نظم غزلوں کے اشعار گو انتخابی غزلوں کے منتخب اشعار لکھے گئے ہیں مگر پھر بھی انتخاب تو کیا ہی جا سکتا ہے۔ یعنی ناظم تمثیل (STAGE DIRECTOR) اپنے سامعین اور ناظرین کے رجحان طبع کا اندازہ کر کے حسب موقع کم یا زیادہ کر سکتا ہے۔

عشاء کی نماز کے واسطے جو مختصر (INTERVAL) وقفہ دیا گیا ہے وہ حقیقتاً اداکاروں کے واسطے بہت ضروری ہے ورنہ عالم ارواح دار العمل تو ہے نہیں جہاں تکالیف شرعیہ لازمی ہوں، بلکہ انٹرول ایک بہانہ ہے اسی طرح کا کہ بقول غالب مرحوم ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عام اجسام کے لوگ چونکہ اس مشاعرے کے سامعین ہیں لہٰذا وہ جب تک اپنا فریضہ ادا نہ کر لیں یک سوئی کے ساتھ مشاعرے کی سماعت نہیں کر سکتے۔ اصل یہ

بات ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلسل ایک انداز پر بیٹھے رہنے سے اداکار تھک جاتے ہیں اور پھر وہ سست عمل ہو جاتے ہیں، ہدایت مصطبہ (STAGE DIRECTION) کی غرض سے بہت سی ضروری ہدایتیں قوسین (BRACKETS) میں لکھی گئی ہیں تاکہ اداکار اپنے آپ کو ان باتوں کا عادی و خوگر بنا کر سچے ممثل بنجائیں اور روپ بھرنے (MAKE UP) میں سہولت ہو۔ بہت کچھ تصاویر کے ذریعہ سے روپ بھرنے میں مدد ملے گی اور بہت کافی طور پر اس عبارت سے جو اس شاعر کے داخلے پر قوسین میں لکھ دی گئی ہے۔

اس عبارت میں جو سنہ دئے گئے ہیں انکا تعلق تاریخ و ادب سے زیادہ ہے لیکن وضع قطع اور طرز لباس کے واسطے بھی بہت ضروری ہیں ایک نقشہ شعراء کی نشست کا ہدایت مصطبہ کے واسطے مفید سمجھ کر بڑھا دیا گیا ہے۔

چونکہ چھٹے سین میں "سیر گاہ عالم ارواح" حقیقت میں اقوال مذہب کی رو سے وہ مقام ہے جہاں تمام روحوں کو (بقولے شب جمعہ اور بقولے شب شنبہ) اپنی جائے اقامت سے نکل کر سیر و طیر کی اجازت ہے۔

میں نے تو حقیقت میں "ایک مجلسی تمثیل" لکھی تھی۔ مگر یہ بزرگانِ ملک معانی کی روحوں کا فیض ہے کہ اس میں تاریخی حیثیت اور تنقیدی صورت بھی نکل آئی بعض ماہرین تعلیم اس میں تعلیمی افادیت بھی پاتے ہیں نثر کے بھی تھوڑے سے تدریجی ارتقار کا پتہ چلتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں اپنے ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوا، یہ تو قارئینِ کرام کی فیاضئِ نظر پر موقوف ہے کہ اگر کچھ دیدہ زیب جواہر پارے ہوں تو ملاحظہ فرمائیں اور جتنے خزف ریزے ہوں انسے

عرض بصر کریں۔

میں نے در اصل بڑی جسارت کی کہ بزرگان فن کے چراغ سے چراغ جلایا جتنے نسخے تذکرۂ شعرا کے مل سکے سب کی خاک چھان کر یہ اکسیر جمع کی۔ پھر حضرت آزاد کے چشمۂ آب حیات سے چند قطرے لایا۔ مولانا شبلی کے موازنہ اور شعر العجم کے گلستانوں سے تھوڑے سے پھول چنے، مرزا فرحت اللہ بیگ کی روشن کی ہوئی "دہلی کی آخری شمع" سے کسب ضیا کی۔ آزاد کے "نیرنگ خیال" سے تھوڑا سا حصہ بقدر رجثہ رنگ اور روپ لیا۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کے آئینہ سے تھوڑی سی عکاسی کا کام لیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو نے بہت کچھ معجز نمائی کی، رسالہ نگار کے "اردو شاعری نمبر" نے میرے اس نگار خانہ کی آرائش میں مدد دی، "سیر المصنفین" میں تنہا صاحب کا سا ہم نشیں ملا۔ میں نے کیا کیا؟ ۔ فقط یہی نا کہ بڑے بڑے سرچشموں سے آب مصفّا لاکر اپنے چھوٹے سے باغیچہ میں آبپاشی کرلی یہ در اصل ان چشموں کے پانی کا فیضان ہے کہ اس چھوٹی سی کیاری میں کئی طرف سے بہار سمٹ کر آگئی ہے جس سے کچھ ہریالی بھی دکھائی دیتی ہے۔

میں نے کیا کیا؟ در اصل ان مختلف سفینوں سے سمٹی ہوئی ہڈیوں پر گوشت پوست منڈھ دیا کہ ذرا ان میں زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں۔ مکالمہ بڑھا کر ان کو گویا کر دیا۔ پرانا مندرس لباس پہنا کر ان کو محفل میں بیٹھنے کے لائق بنا دیا تذکرہ و تبصرہ کا اضافہ کرکے ان کا کلام سننے اور صورت دیکھنے کے لائق بنا دی نقد تنقید ان کی جیبوں میں ڈال کر ان کو مالدار بنا دیا کہ دنیا میں انکی وقعت ہو۔ اور کیا کیا؟ اب آپ چاہے مجھ کو "مؤلف" کہیئے چاہے "نقال"

اس باغ کی نخل بندی میں مدد کرنے والوں کے سلسلہ میں اگر چند اپنے ہمدردوں کا ذکر نہ کروں تو دل نہیں مانتا کہ ان کی ہمدردی کا اظہار نہ کرنا احسان فراموشی کا مترادف ہے۔ پھر زبان سے ان کا نام نکالتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں کہ انکے اصرار کے باوجود اس کے ظاہر کرتے میں ان کی خاطر شکنی ہے۔ ع

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اچھا صاحب! اپنی زبان پر قابو ہے نہ بولوں گا، مگر قلم کی دوہری زبان کو کیونکر روکوں، یہ تو قینچی کی طرح چلے جاتی ہے، اشکر تو یہی ہے کہ متواضع المحبۃ تیں ہے اسی لئے اس کی زباں بندی بھی نہیں کر سکتا۔ اس تمثیل کی تشکیل و ترتیب کے موئید میرے حبیب شفیق چودھری وجیہہ الدین حسن عثمانی مرحوم ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی پروفیسر ریاضیات کا نام زبان قلم پر بے اختیار جاری ہو جاتا ہے۔ دراصل ان کی تشویق سے اس کی تشکیل و ترتیب عمل میں آئی ہمئی ۱۹۴۷ء سے میں نے اسکو مرتب کرنا شروع کیا اور فروری ۱۹۵۵ء میں یہ تکمیل کو پہنچ گئی تھی کئی سال کی مسلسل کوشش میں متن کتاب تیار ہوا، ٹائم چارٹ اور ضمیمے بھی تقریباً دو تین ماہ کی کوشش میں مرتب ہوئے اسی طرح تقریباً ۷ سال کی سرگرمی میں یہ تمثیل تیار ہوئی ہے۔

ان کرم فرما احباب کی فہرست طویل ہے جنھوں نے اس تمثیل کے مسودے کو گوش نقد سے سُنا اور چشم تبصرہ سے دیکھ کر اپنا بہت قیمتی وقت (جبکہ ہر چیز پر کنٹرول تھا) صرف کر کے عمدہ اور پسندیدہ مشوروں سے سرفراز کیا۔

ان عنایت فرما بزرگوں کی خدمت میں تشکر و امتنان کے گلہائے عقیدت نذر

کروں گا جو احسان فرما کر براہ کرم "پیش لفظ" یا لفظ نخستین (FOREWORD) تحریر فرما دیں۔

کاتب صاحب کا شکریہ تو پہلے ہی ادا کئے دیتا ہوں اس ڈر سے کہ اگر وہ خوش نہ ہوئے تو ان کی ذرا سی جنبشِ قلم میری سب محنت ٹھکانے لگا دے گی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرف عصا گفت موسی اندر طور

سید مرتضیٰ حسین موسوی
لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

پیش گفت

PROLOGUE

"دہلی کی آخری شمع" کی روشنی میں آج سے ۱۰۰ برس پہلے کے جو زندہ مشاہیر اساتذہ کہ گرد و نواح دہلی میں رہتے تھے تو ان کی صورتیں شاہی درباری شاعرے میں ہم نے بڑی آب و تاب سے دیکھی تھیں۔ مگر وہ ایک ہی وقت کے معاصر شعراء کی محفل تھی جس میں شاہی تزک و احتشام کے مناظر ہمارے پیش نگاہ تھے۔ شعر کا تدریجی ارتقاء نہ تھا۔

یہاں اسٹیج پر شاعری اور ارتقائے زبان کے تمام دور کے مرقعے سے آپ کی دعوتِ نگاہ مدنظر ہے۔ اس مشاعرے میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ کم سے کم سامان اور زیادہ سے زیادہ سادگی ملحوظ رہے۔

پہلے آپ ملاحظہ کریں گے کہ مولانا محمد حسین آزاد مولانا شبلی عالم ارواح کے ایک سبزہ زار میں ٹہل رہے ہیں، اُردو زبان کی بگڑی ہوئی صورت، اور بائل بہ تنزل حالت تہذیب و طرز معاشرت، جدید شاعری کی بے اصولی اور بے راہ روی پر تاسف و ملال ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے سدھارنے کی تدبیر سوچ رہے ہیں۔ کہ مرزا فرحت اللہ بیگ آجاتے ہیں، ان کو دیکھ کر معاً ان کے عملی اقدام کا خیال آتا ہے اور اسی تجربے کو پھر سے آزمانے کی رائے

ہوتی ہے۔ طے ہوتا ہے کہ شاعری کے باوا آدم حضرت ولی دکنی کو آمادہ کرکے ایک مشاعرہ منعقد کریں چنانچہ ان کی خانقاہ میں جا کر اپنا اظہار خیال کرتے ہیں یہ تینوں آدمی اپنے زمانے کی بولی میں گفتگو کرتے ہیں اور ولی اپنے عہد کی زبان میں جواب دیتے ہیں مشاعرہ کیا جانا طے پاتا ہے چاندنی کی چودھویں شب مشاعرے کے لئے مقرر ہوتی ہے۔ یہی تینوں آدمی ولی کے وکیل اور مشاعرے کے مہتمم مقرر ہوتے ہیں۔ ہر ہر عہد کے شعراء ہر صنف کلام کے کاملین مدعو ہوتے ہیں بعض مشاہیر جو صاحب طرز خاص ہیں ان سے وعدہ سیر گاہ عالم ارواح میں شبلی اور آزاد لینے نکلتے ہیں۔ اس طرح آٹھ مختلف عہد کے شعرا سے گفتگو ہوتی ہے جس سے ہر صدی کے مختلف حصوں میں جو جو تغیرات بولنے والی نثر کی زبان میں ہوئے ہیں۔ ظاہر ہوتے ہیں دیگر شعرا سے جائے اقامت پر جا کر وعدہ لیتے ہیں، کوئی طرح مقررہ نہیں ہوتی۔

وکلاء نے اپنے مقام پر طے کیا ہے کہ شعراء کو اس ترتیب سے بٹھائیں گے کہ ان کی نشست سے ان کے عالم ارواح کے داخلے کی تاریخ اور تقدم و تاخر بیک نظر سمجھ میں آجائے۔ میر تقی میر سے ان کی نازک مزاجی کے کارن ہر ایک وعدہ لینے میں پس و پیش کرتا ہے ان کا وعدہ ولی اللہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ باقی شعرا کی فہرست کے نام تینوں آدمی بانٹ لیتے ہیں۔ نظیر کے پاس وعدہ لینے حالی اس واسطے بھیجے جاتے ہیں کہ جس طرح آزاد نے ان کا ذکر آب حیات میں نہیں کیا اسی طرح شبلی نے اپنے نوشتہ جات میں نظیر کے کلام کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے ان کے برخلاف حالی صاحب نظیر کے بے نظیر ہونے کے مقر ہیں۔ اس لئے انھیں کو بھیجا جاتا ہے، دہلی کے بہادر شاہ ظفر اور لکھنؤ کے واجد علی شاہ اختر سے بھی سیر گاہ عالم ارواح میں وعدہ ہوتا ہے۔

پانچویں سین میں تمام شعرا آتے ہیں اور چھٹے میں تکمیل محفل کے بعد مشاعرہ شروع ہوتا ہے، باقی مشاعرہ حضرت ولی سے شروع ہو کر تعشق کے کلام پر وقفہ (انٹرول) ہو جاتا ہے پھر جان صاحب کے کلام سے شروع ہو کر آرزو پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد کلام الملوک پر مشاعرہ ختم ہوتا ہے دور مشاعرہ تمام ہو جاتے پر ساتویں سین میں محسن کاکوروی اپنا قصیدہ لامیہ (نعتیہ) پڑھینگے اسکے بعد آٹھویں سین میں خاتمہ اور دعا کا منظر ہے۔ کلام مرزا دبیر اور میر انیس کے بعد ختم و دعا۔

اس تمثیل کے خاتمہ پر ناظرین کرام کیا لے کے اٹھیں گے؟ مذاق سلیم کی ٹکسال کے مستند اور معیاری ہر قسم کے سکے ایسے کامل عیار کہ خود معیار بننے کے قابل جو کھرے کھوٹے کی پہچان کرا دیں اور ایسی قیمت بیدار رکھنے والے کہ جن سے بازار ادب کی ہر جنس گراں بہا خریدی جا سکے۔

بغیہ مشک گنج
لکھنؤ

سید مرتضیٰ حسین موسوی
سنہ ۱۹۵۵ء

اشخاص تمثیل

DRAMATIS PERSONOE

(۱) بادشاہ۔ (ا) بہادر شاہ ظفر آخری شہنشاہ دہلی متوفی ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء

(ب) سلطان عالم واجد علیشاہ اختر۔ آخری تاجدار اودھ " ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۸ء

(۲) منتظمین مشاعرہ (ا) مولانا محمد حسین آزاد۔ صاحب آب حیات وغیرہ " ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء

نقادین (ب) مولانا محمد شبلی شبلی " شعر العجم وغیرہ " ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء

(ج) مرزا فرحت اللہ بیگ " دہلی کی آخری شمع " ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء

(۳) بانی مشاعرہ حضرت شمس اللہ ولی (دکنی) ابو الآباؔ نظم اردو " ۱۱۵۵ھ ۱۷۴۲ء

(۴) شرکاء

(۱)	سوداؔ	متوفی	۱۱۹۵ھ	۱۷۸۱ء
(۲)	دردؔ	"	۱۱۹۹ھ	۱۷۸۴ء
(۳)	حسنؔ	"	۱۲۰۲ھ	۱۷۸۷ء
(۴)	میرؔ	"	۱۲۲۵ھ	۱۸۱۰ء
(۵)	جرأتؔ	"	۱۲۲۵ھ	۱۸۱۰ء
(۶)	انشاؔ	"	۱۲۳۳ھ	۱۸۱۸ء
(۷)	مصحفی	"	۱۲۴۰ھ	۱۸۲۵ء

(۸)	نظیر	متوفی	۱۲۴۵ھ	۱۸۳۰ء
(۹)	رنگین	"	۱۲۵۲ھ	۱۸۳۶ء
(۱۰)	ناسخ	"	۱۲۵۴ھ	۱۸۳۸ء
(۱۱)	نسیم	"	۱۲۶۳ھ	۱۸۴۷ء
(۱۲)	آتش	"	۱۲۶۳ھ	۱۸۴۷ء
(۱۳)	مومن	"	۱۲۶۸ھ	۱۸۵۲ء
(۱۴)	ذوق	"	۱۲۷۱ھ	۱۸۵۴ء
(۱۵)	شوق	"	۱۲۷۱ھ	۱۸۵۵ء
(۱۶)	غالب	"	۱۲۸۶ھ	۱۸۶۴ء
(۱۷)	انیس	"	۱۲۹۱ھ	۱۸۷۴ء
(۱۸)	دبیر	"	۱۲۹۲ھ	۱۸۷۵ء
(۱۹)	جان	"	۱۲۹۷ھ	۱۸۹۰ء
(۲۰)	تعشق	"	۱۳۰۹ھ	۱۸۹۲ء
(۲۱)	امیر	"	۱۳۱۸ھ	۱۹۰۰ء
(۲۲)	محسن	"	۱۳۲۳ھ	۱۹۰۵ء
(۲۳)	داغ	"	۱۳۲۳ھ	۱۹۰۵ء
(۲۴)	جلال	"	۱۳۲۷ھ	۱۹۰۹ء
(۲۵)	سرور	"	۱۳۲۸ھ	۱۹۱۰ء
(۲۶)	برق	"	۱۳۲۹ھ	۱۹۱۱ء

(۲۷)	حالی	متوفی	۱۳۳۲ھ	۱۹۱۴ء
(۲۸)	رشید	"	۱۳۳۷ھ	۱۹۲۰ء
(۲۹)	اکبر	"	۱۳۳۹ھ	۱۹۲۱ء
(۳۰)	چکبست	"	۱۳۴۴ھ	۱۹۲۶ء
(۳۱)	شاد	"	۱۳۴۴ھ	۱۹۲۷ء
(۳۲)	ریاض	"	۱۳۵۳ھ	۱۹۳۴ء
(۳۳)	عزیز	"	۱۳۵۴ھ	۱۹۳۵ء
(۳۴)	ظریف	"	۱۳۵۶ھ	۱۹۳۷ء
(۳۵)	اقبال	"	۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء
(۳۶)	فانی	"	۱۳۵۹ھ	۱۹۴۱ء
(۳۷)	ثاقب	"	۱۳۶۵ھ	۱۹۴۶ء
(۳۸)	صفی	"	۱۳۶۹ھ	۱۹۵۰ء
(۳۹)	آرزو	"	۱۳۷۰ھ	۱۹۵۱ء

مشاعرۂ عالم ارواح

سین پہلا

تشکیل ——————— ایک میدان

دونوں وقت ملنے کا سماں۔ پُر فضا میدان میں پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے کنج۔ اُن کے پیچھے شفق آلود آسمان ہے۔ کنجوں کے سامنے لہلہاتا ہوا سبزہ زار اُس کے قریب ہی ایک چشمے سے پانی اُبل رہا ہے۔

داخلہ ...... مولانا آزاد اور علامہ شبلی داخل ہوتے ہیں۔

(داہنی سمت سے) مولانا آزاد ٹہلتے ہوئے سبزہ زار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

[ان کا کھلتا گندمی رنگ، بلند بالا۔ پنجابی ہاتھ پیر دوہرے بدن کے آدمی پیشانی کشادہ، روشن آنکھیں، بھری بھری گول داڑھی جو گندمی رنگ کے بالوں میں سفیدی کی جھلک نے چہرے کو پُر نور کر دیا ہے۔ مونچھوں کے تاؤ کٹے ہوئے ہیں۔ دہلی کی درباری پگڑی جس کے نیچے پٹوں کے بال جو کان کی لو تک سیدھے ہیں اور لَوؤں کے نیچے مُڑ کر اوپر کی طرف پیچ کھا گئے ہیں۔

سفید لمبا کرتا، گلو کھلی واسکٹ کرے نیچی سیاہ رنگ کی، اوپر شمس العلماء
کا جبہ۔ سفید بڑی مہری کا پائجامہ۔ زرد مخمل کا فل سلیپر۔ سیاہ جرابیں۔
انتہا کے ذکی و ذہین آدمی ہیں۔ الفاظ و محاورات کی تحقیق کے
دل دادہ زبان اردو میں تنقید اور فلالوجی کے موجد، بذلہ سنج و لطیفہ گو
شگفتہ مزاج، اول نمبر کے نثر نگار۔ انتہائے پاکیزگی و نفاست سے
زندگی بسر کرنے والے۔ فاضل جلیل القدر عربی اور فارسی کے منتہی۔
[پیدائش سنہ ۱۲۴۱ھ، سنہ ۱۸۳۲ء) اورینٹل کالج لاہور میں پرشین
پروفیسر، شاعری میں طرز جدید کے موجد، ابتدا سے استاد ذوق کے
سایۂ عاطفت میں پرورش پائی، فن عروض ان ہی سے سیکھا، علوم و
فنون کی تکمیل پرانے دہلی کالج میں کی۔ ذوق کے ساتھ بڑے بڑے
مشاعروں میں شریک ہوئے۔ ذوق کے ساتھ ان کے ہمعصر جلیل القدر
شعراء سے روشناس ہوئے۔ مصنف آب حیات، سخندان پارس
نیرنگ خیال، قند پارسی، دربار اکبری وغیرہ وغیرہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء
میں وفات پائی۔]

آزاد کے مقابل سمت سے مولانا شبلی عصا ہاتھ میں لئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

[مولانا شبلی نعمانی نام، شبلی تخلص، پیدائش اعظم گڑھ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء
وفات ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء

صاحت گورا رنگ، اکہرا ڈیل، قدرے پستہ قد، سر پر خشخشی بال، جو گندمی
داڑھی سفیدی زیادہ چھدری "یک مشت و سہ انگشت" مونچھیں ذرا

لمبی شرمی انداز پر گھنی ہوئی، آنکھوں میں ذہانت کے آثار، عالمانہ عمامہ پشت پر طویل شملہ۔ وسط پیشانی عمامہ سے کھلی ہوئی، کریم کلر کی سلک کی عبا، آستینیں آگے سے کھلی ہوئی لمبی انگلیوں تک پہونچتی ہیں شمس العلما کا جبہ جس کی آستینوں پر عبا کی آستینیں الٹ لی گئی ہیں بڑی مُہری کا سفید ذرا اونچا پائجامہ، بے گیٹس کی سفید جرابیں، بکلس دار براؤن کا پمپ۔

علی گڈھ میں سر سیّد کے سامنے پروفیسر آن پرشین۔ اعلیٰ درجہ کے نقاد، مصنّف شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر وغیرہ، انکی ذات میں ایک شاعر ایک فلسفی، ایک مؤرخ، ایک نقاد، ایک معلم، ایک ماہر تعلیم، ایک واعظ، ایک نثار، ایک محدث، ایک فقیہہ بیک وقت جمع تھے، نہایت خلیق متواضع آدمی ہیں سر سیّد کی شخصیت اور محمد حسین آزاد کی سنین الاسلام سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی رگ حمیت میں نامورانِ اسلام کی سوانح لکھ کر جوش پیدا کیا۔

ندوۃ العلماء (لکھنؤ) دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے بانی۔

وسط سبزہ زار میں پہونچکر۔

آزاد: (مولانا شبلی سے) ۔ ۔ ۔ ۔ سلام علیکم مولانا!

شبلی: (جواباً) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

(باہم مصافحہ۔ دونوں حضرات چہل قدمی کرتے ہوئے کبھی ادھر، کبھی ادھر ٹہل رہے ہیں)

آپ نے شعر العجم میں جو لکھا ہے کہ "وہ شاعر کا قلم اس مقام پر کامیاب ہوتا ہے جہاں نقاش انگشت بدنداں رہ جاتا ہے" تو وہی پورا منظر یہاں اس وقت پیش نگاہ ہے ؎

رنگ رنگ نسیم زیر گلاں می خزد ۔۔۔ غبغب ایں می مکد عارض آں می مزد
گیسوئے ایں می کشد گردن آں می گزد ۔۔۔ کہ بچمن می چمد کہ بہ سمن می وزد

گاہ بشاخ درخت گہ بہ لبِ جوئبار

شبلی :۔ درست فرماتے ہیں مولانا! آپ کی اور میری متحدہ کوششیں جو حقیقتاً ایک دوسرے کی متمم ہوئی ہیں اسی واسطے تھیں کہ اردو ادب کے طلبہ میں "مذاق سلیم" اور صحیح معیار تنقید پیدا ہو۔ مگر مغربی ادب کی کورانہ تقلید نے موجودہ اردو ادیبوں کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

آزاد :۔ صحیح ہے! اور اصل جدت طرازی کی اُمنگ جب وسیع النظری اور مذاق سلیم کے ساتھ نشو و نما کرے تو قابل صد تحسین ہے، لیکن کوتاہ نظری، کمی مطالعہ، فقدان مذاقِ سلیم جدت طرازی کو چیستان اور جدّت کو ہزل بنا دیتا ہے۔

شبلی :۔ مغرب کی تخئیل اور یورپ کے اصول محاکات کو اگر اپنے ملکی ماحول سے سمولیا جائے اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کریں تو عزیز الوجود اور دلپذیر ادبی کارنامے پیدا ہو سکتے ہیں۔

آزاد :۔ بشرطیکہ "مذاق سلیم" کے حدود میں بھی رہیں۔

شبلی :۔ یہ تو لازمی امر ہے۔ اگر ذوق سلیم کی شاہراہ سے قدم ڈگے تو پھر

گمراہی اور بے راہ روی ہی ہے یا پھر آپ کی طرح کوئی اس انتہائے مذاق سلیم پر فائز ہو تو مشرقی اور مغربی ادب کو ایک جگہ جمع کر کے نیرنگ خیال کی طرح نتیجہ خیز اور خیالی افسانوں کی بنیاد ڈال سکتا ہے! مولانا! یہ تو دراصل آپ نے وہ کام کیا ہے کہ ایک بہت بڑے خلاء کو جو اردو میں تھا پورا کر دیا۔ یورپ کی ایلی گری اردو میں لکھ کر "رمزیہ" کی کمی کو پورا کر دیا۔

اد :- مولانا نظم طباطبائی نے بھی ایک ایسی نظم کو جس کی تخئیل کا ہر چھوٹے سے چھوٹا جزو اور محاکات کا ایک ایک لفظ مغربی خیال اور تہذیب کا آئینہ دار تھا محض مذاق سلیم کے زور سے ایسے دل پذیر طرز میں ڈھالا کہ اگر کسی نے طامس گرے کی ایلیجی نہ پڑھی ہو تو اس کو یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ علامۂ نظم کے مغربی نظم کو منظوم کیا ہے۔

لی :- اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ شاعری ہو کہ نثر نگاری، مصوری ہو کہ سنگ تراشی۔ غرضکہ فنون لطیفہ کے ہر ہر شعبے کے واسطے مذاق سلیم ایک کافی معیار پر ہونا لازم و واجب ہے۔

اد :- آپ کی اور میری کوششیں اہلِ ملک میں مذاق سلیم ہی پیدا کرنے کے واسطے تو تھیں۔ آپ کی شعر العجم نے میری آبِ حیات کے حق میں بقا کا کام کیا۔ اس واسطے کہ اردو شاعری میں فارسی جزو غالب ہے اگر فارسی نظم سے بقدر ضرورت واقف نہ ہوں تو اردو شاعری اور نثر نویسی دونوں بے نمک اور بے مٹھاس کا شربت ثابت ہوں گی

شبلی :- آپ کے ہمہ گیر دماغ اور تبحر علمی نے اردو کو تنگنائے خیال و مف
سے نکال کر ایک نیا میدان دکھایا اور نظم جدید اور تنقید کا سہرا تو آپ
کے سر ہے آپ نے نثر میں آب حیات لکھ کر نہ فقط اردو کی تاریخ کو صحیح راہ
پر لگایا بلکہ تمام سابق تذکرہ نویسوں کے برخلاف فن تنقید کا بھی معیار ار دو
قائم کر دیا۔ آب حیات ایک ایسی جامع و مانع تاریخ ادب اردو دنیا کے ر
پیش کر دی کہ آج تک جو شخص تاریخ ادب اردو کے میدان میں آتا ہے
بغیر آب حیات کی مدد کے قدم نہیں اٹھا سکتا لیکن بڑی دقت تو یہ ہے کہ لوگ
نے آب حیات، اور شعر العجم کو یا تو پڑھا ہی نہیں یا پڑھ کر بھلا دیا۔

آزاد :- تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ جو قدر آپ نے آب حیات کی کی وہی تمام
کرے؟ آپ نے تو میری تعزیتی مجلس میں ندوۃ العلماء میں یہ فرمایا تھا
"آج اس شخص کا ماتمی جلسہ ہے جس کی اس کتاب آب حیات کو میں
اٹھارہ مرتبہ پڑھا ہے۔

شبلی :- مولانا! یہ واقعہ تھا جو میں نے کہا، اس وقت میں نے اٹھارہ ہی بار
پڑھا تھا اس کے بعد نہیں معلوم پھر کتنی بار بالاستیعاب پڑھا۔

(سامنے سے مرزا فرحت اللہ بیگ (مصنف دہلی کی آخری شمع) ان دونوں آدمیو
کی طرف بڑھتے ہوئے آتے ہیں)

[فرحت اللہ بیگ۔ پیدائش سنہ ؟ دہلی۔ وفات ۱۹۴۷ء حیدرآباد دکن
بہت گورا رنگ۔ درمیانی قد۔ دوہرا جسم۔ گول چہرہ۔ کلین شیو۔
سر کے بال بالکل سفید۔ بات کرتے میں بائیں طرف کا رخسار اور اسی طرف

کی باچھ کھنچ جاتی ہے۔ بہت خوش مزاج ظریف الطبع ہشاش بشاش آدمی ہیں سلیم شاہی جوتا، علی گڑھ کٹ کا پائجامہ، حیدرآبادی شیروانی سیاہ کرشٹی کیپ]

فرحت اللہ بیگ (دونوں حضرات کو) مؤدبانہ طریقے سے سلام علیکم

شبلی و آزاد (علیکم السلام (مصافحہ باری باری)

شبلی:۔ ہم لوگ ابھی موجودہ مذاق شاعری پر جو دنیائے اردو میں رائج ہوگیا ہے گفتگو کر رہے تھے۔ آپ نے بھی حقیقتہً ادب کی بڑی خدمت کی۔

آزاد:۔ مرزا صاحب! "دہلی کی آخری شمع" لکھ کر آپ نے آب حیات کو آئینہ بنا دیا۔

فرحت:۔ اور اہل لکھنؤ کی کامیاب تمثیل نے میری آخری شمع کی روشنی کو اور پر آب و تاب کر دیا۔ حقیقتہً وہ پورا مرقع، جس کی سب تصویریں آب حیات سے اتاری گئی تھیں" کب کا مدھم ہو جاتا اگر یہ کامیاب تمثیل اس کو اجاگر نہ کر دیتی۔

شبلی:۔ کیا کہنا لکھنؤ پھر لکھنؤ ہے اتنی کامیاب تمثیل سوائے سرزمین لکھنؤ کے جس میں جگر "مٹ گئے پھر بھی لاکھ جوبن ہے۔" اور کہاں ہو سکتی تھی!

آزاد:۔ بہت سے لوگ جو چشمۂ آب حیات سے سیراب ہو چکے تھے اور اب اس کا مزہ بھول بھی چکے تھے پھر ان کے کام و دہن میں تمثیل نے حلاوت پیدا کر دی۔ مرزا صاحب! آپ کو مبارک ہو کہ ہماری کتابی اور علمی خدمت سے آپ کا عملی اقدام زیادہ کارگر ہوا۔

"دہلی کی آخری شمع" کے مشاعرے کی تمثیل پہلی بار ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی (امیر الدولہ اسلامیہ کالج)

فرحت: حقیقت میں کتاب پڑھ کر لوگوں کو کم فائدہ ہوا، لیکن اس عملی تمثیل

ہزاروں کو محفلِ شعر کا گرویدہ بنا لیا، سیکڑوں آدمی مشاعرے کے ادبی

معاشرتی افادیت کے قائل ہو گئے۔

آزاد:۔ (شبلی سے مخاطب ہو کر) مولانا! میں نے بھی اپنی زندگی میں ملک کے ذ

ارتقا کے واسطے نئے طرز کے مشاعرے ہی سے اصلاح مذاق

درستی معاشرت کی داغ بیل ڈالی تھی اور اسی نسخہ

مذاق سلیم چوپٹ پال ہو گیا تھا۔

شبلی:۔ (آزاد سے) تو پھر ایک مشاعرہ یہاں بھی منعقد کیا جائے تاکہ فضائے

عالم ان پیغمبرانِ شریعت سخن کی معجز نما آوازوں سے گونج جائے ا

ان بزمِ ادب کی نورانی شمعوں کی روشنی سے عالم آب و گل منور ہو جائے

آزاد:۔ بہت مناسب رائے ہے۔ مگر اس کام میں کوئی اسٹر کا یار ادبی

تو پھر بیڑا پار ہے..... (کچھ سوچ کر) چلیے بس اسی وقت چل کر حضر

شمس ولی اللہ کی خدمت میں ہم لوگ استدعا کریں، وہ سب شع

کے دادا پیر ہیں اور ابو الآبائے غزل۔ ان کے حکم سے ایک دعوت نامہ تم

شعراء کو بھیج کر ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے جس میں ہر دور کے چند چید

چیدہ اساتذہ مختلف اصناف سخن پر اپنا منتخب کلام پڑھ پڑھ کر فضائے

عالمِ اجسام میں صحیح مذاق سلیم کی تاثیر پیدا کر دیں۔

(سب لوگ اُٹھ کر جاتے ہیں)

پردہ گر جاتا ہے

سین دوسرا

ولی دکنی کی قیام گاہ

[ایک پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا سبزہ زار ہے خانقاہ کی طرح ایک مختصر سی عمارت ہے بہت صاف ستھری جگہ ہے آگے پیچھے دالان در دالان، اگلا دالان ذرا مختصر پچھلا دالان اس سے وسیع تر جس میں تین دکھنی محرابیں اس کے اندر کی طرف ایک مسہری بچھی ہوئی ہے باقی دالان میں سفید چاندنی کا فرش ہے آگے کے دالان میں مسہری کے مقابل حصے میں چھوٹے چھوٹے تختوں کا فرش جس پر سفید چاندنی بچھی ہے اس پر مسند دوسری سمت ایک مختصر چوکی جس پر مصلّی بچھا ہوا ہے مصلّے پر حضرت شمس ولی اللہ رو بہ قبلہ تسبیح ہاتھ میں لئے مراقبے میں بیٹھے ہیں]

شمس ولی اللہ۔ پیدائش ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۷ء ؟ وفات ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۴ ؟

سانولی رنگت، متوسط قد۔ ۷۰ سال کی عمر کے بوڑھے آدمی۔ لمبی سفید داڑھی مہندی کا خضاب صوفیانہ روش کی شرعی مونچھیں مہندی کا خضاب لگا ہوا۔ (ناک کے نیچے مونچھیں بالکل صاف نتھنوں کے حدود سے آگے بڑھ کر لبے لبے کنارے) لمبی لمبی زلفیں خضاب لگا ہوا آنکھوں میں سرمہ، سر پر دکھنی بڑی سی پگڑی۔ نارنجی رنگ کا ایک بہت ڈھیلا ڈھالا جامہ۔ ایک ایک کلی کا شرع کا پاجامہ کہنی کا مدار جوتا[1]

---

[1] دکھنی جوتے میں ایڑی کی طرف اڈی نہیں ہوتی تھی (دیکھو شیواجی کی تصویر گھوڑے پر سوار

چوکی کے نیچے رکھا ہوا ہے۔۔۔ دونوں دالانوں کے تھوڑا سا صحن ہے جس کو پھولوں کے درختوں سے محدود کر دیا ہے۔ آمد و رفت کا ایک راستہ صاف چھوڑ دیا ہے]

داخلہ:۔ (آزاد۔ شبلی۔ فرحت اللہ داخل ہوتے ہیں) آگے آگے آزاد اور شبلی دوش بدوش ان کے پیچھے فرحت اللہ۔)

آزاد:۔ (دالان میں پہلے قدم رکھتے ہوئے) سلام علیکم

ولی:۔ (ذرا سر اٹھا کر) وعلیکم السلام! کچھ بلند ہو کر تعظیم دیتے ہیں) ۔ مصافحہ (آزاد۔ شبلی اور فرحت اللہ بیگ کا تعارف کراتے ہیں) اور یہ لوگ ولی کو سلام کرتے ہیں ان سے بھی مصافحہ ہوتا ہے۔

ولی:۔ (مسند کی طرف اشارہ کر کے) تم صاحبان تشریف رکھو۔ (سب بیٹھ جاتے ہیں)

آزاد:۔ جناب سامی مرتبت کی خدمت میں ہم لوگ یہ استدعا لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ اردو شاعری جس کے دیوان کو عالی جناب نے سب سے پہلے مرتب کیا اور حقیقت میں جناب گرامی مرتبت ہی ریختہ گویان ہند کے استاد الاساتذہ ہیں، جناب عالی کا کلام وہ روشن و نورانی چراغ راہ ہدایت ہو کہ جس کی روشنی میں شاہراہ شاعری کے کامیاب راہرو منزل ارتقائے فن تک پہونچے، اب وہی شاعری دور جدید میں پہونچکر مذاق سلیم کے جادۂ مستقیم سے دور ہو کر زاویۂ ضلال میں پھنس گئی ہے، اس کی درستی کی کوئی صورت ہونا چاہیئے۔

ولی:۔ ہمن کون جگ منے نیت یہی کوشش رہی کہ ریختہ بھیتر محاورات رائج ہوں۔ ھور سنجیدہ مضامین کوں شائستہ بچن کے باس نظم کریں۔ ریختہ بھیتر وسعت کلام ھور تنوع کا یوہ کارن ہوا۔

شبلی:۔ عالی جناب! اب تو اردو شاعری صرف ممالک مغربی کے خیالاتِ پریشان کا مرقع بن گئی ہے۔ جس میں فصاحت و بلاغت الفاظ۔ حسنِ محاورات کا بالکل شائبہ بھی نہیں ہے۔

آزاد:۔ جناب والا! بڑا غضب تو یہ ہوا کہ مذاق سلیم بھی ختم ہوا جاتا ہے۔

فرحت:۔ (آزاد و شبلی سے مخاطب ہو کر) مولانا ادب جدید کے علمبرداروں نے قافیہ اور ردیف کے حدود سے آزادی تو کب کی حاصل کرلی تھی۔ اب تو ان کا کلام موزوں۔ بحر اور وزن کا بھی منت کش نہیں ہوتے پاتا۔

ولی:۔ پھر اس کوں کلام موزوں کیوں کہا جائے اچھے؟ (فرحت اللہ کی طرف اشارہ کر کے) یوہ حال منے ہمن نگر بیچ وارد ہوا اچھے؟

آزاد:۔ جی ہاں! آپ (فرحت اللہ) ابھی حال ہی میں تشریف لائے ہیں! آپ کو عالم اجسام کے تازہ تازہ حالات معلوم ہیں آپ اس دور کے اچھے نثار و نقاد ہیں۔ آپ نے شعرائے دہلی کے آخری دور کا ایک مشاعرہ لکھ کر اردو ادب کی گراں قدر خدمت کی۔

ولی:۔ بھلا وہی مشاعرہ جو پار سال آوانِ موسم بہار منے اودھ کے ایک نگر بیچ ہوا؟

شبلی:۔ جی ہاں! وہی مشاعرہ جس کو تلامذۂ لکھنؤ نے تمثیلاً پیش کیا تھا۔ اس نے

اہلِ ذوق کو مشاعرے کی افادیت سے آگاہ کر دیا اور مذاقِ سلیم جو ان کے گوشۂ خاطر میں خفتہ تھا بیدار کر دیا۔

آزاد:۔ اسی خیال کے بموجب ہم لوگ خدمتِ والا میں حاضر ہوئے ہیں کہ اگر ایمائے عالی ہو تو ایک مشاعرہ یہاں بھی منعقد کیا جائے جس میں چند بزرگ اساتذۂ ریختہ کے کلام سے سامعہ نوازی کی جائے تاکہ فضائے عالم میں صحیح طور پر مذاقِ سلیم سرایت کر جائے۔

ولی:۔ بھوت مناسب اچھے مُراتم صاحبان سوں یوہ کا انصرام اس جائیگہ نیچ ہوسکے اچھے؟

شبلی:۔ جی ہاں! ہم لوگ سب انتظام آنجناب کی نیابتہً کرلیں گے مگر دعوتِ مشاعرہ جنابِ والا مرتبت ہی کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے مناسب ہے۔ ہم لوگوں کی کیا مجال جو ان شاہانِ ملکِ معانی کو مدعو کرسکیں۔

آزاد:۔ جنابِ والا کے ارشاد پر سب سمعاً و طاعاً کہیں گے۔ کیونکہ "شاہاں بہ شاہاں دعوت می دہند"

ولی:۔ ہمن نے تم صاحبان کوں آپن وکیل گردانا۔ ہمن کوں جن جن سوں درکن ہوگی نوید دیویں گے۔

آزاد:۔ (شبلی سے) حقیقت میں حضرت کو اس پیرانہ سالی میں یہ زحمت بہت دشوار ہے۔ رات دن آپ کو اپنے اوراد و وظائف سے (جنکی عادت بالکل طبیعتِ ثانیہ ہو گئی ہے) اتنی مہلت کب ہے کہ فرداً فرداً سب سے وعدہ لیتے پھریں۔ ہم، آپ اور مرزا صاحب شعراء کی فہرست مرتب

کر کے تھوڑے تھوڑے نام بانٹ لیں اور حضرت (ولی کی طرف اشارہ) سے دستخط مبارک لے لیں۔ مگر میر صاحب کس کے ہاں کے ہیں وہ ہیں انتہا سے زیادہ نازک مزاج ، کیا معلوم کس وقت کس خیال میں ہوں۔ کہیں اگر خفا ہو گئے تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔

ولی :- (ان لوگوں کی باتیں سن کر) تم صاجان فہرست کو ترتیب دو ہم دستخط کر دیں گے۔ رہا تقی کا معاملہ سو ہم آپن اس سوں کہ لیویں گے۔

شبلی :- بہت مناسب ہے! (آزاد سے) لیجئے یہ مشکل بھی اللہ کے پیارے ولی نے حل کر دی (ذرا مسکرا کر) اچھا تو مرزا نوشہ سے تو آپ ہی وعدہ لے لیں گے یا اس میں بھی کچھ پس و پیش ہے؟

آزاد :- ہاں۔ ہاں! میں ان کی خدمت میں جانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں اور مرزا صاحب میرے وعدے پر ضرور تشریف لائیں گے وہ میرے واسطے ویسے ہی قابل احترام ہیں جیسے استاد ذوق۔ اگر ضرورت ہوئی تو استاد ذوق کو ساتھ لے کر جاؤں گا ان بزرگوں کے دل مثل آئینہ کے صاف ہیں۔ اہل دنیا جو چاہے خیال کریں۔ یہ پاک روحیں ان خیالات سے بہت بلند ہیں۔

فہرست شعراء جو شبلی و آزاد نے مل کر مرتب کی تھی حضرت ولی کے سامنے

لہ آب حیات میں مولانا آزاد نے اپنے استاد ذوق کے حالات زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کے ہم عصر مرزا نوشہ غالب کے واقعات کچھ مختصر طور پر، اسی پر معترضین آزاد مولانا کو معرض تعریض بنائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے شبلی مسکرا کر پوچھتے ہیں۔

پیش کی گئی۔ حضرت نے اس پر دستخط ثبت کر دیا اور ان تینوں آدمیوں کے نام دعوت دینے کی وکالت بھی لکھ دی۔

آزاد :۔ (ولی سے) تاریخ کون مناسب ہو گی؟

ولی :۔ ایام البیض کی کوئی مناسب شب اچھی۔

آزاد :۔ اگر مناسب ہو تو جہاں پناہ بہادر شاہ ظفر کو بھی مدعو کیا جائے؟ یہ خود بھی شاعر تھے اور دہلی کے دور آخر کے شعراء کے سرپرست اور مربی بھی تھے!

شبلی :۔ بیشک! میں آپکی تائید کرتا ہوں بلکہ حضرت سلطان عالم واجد علیشاہ اختر کو بھی شریک کیا جائے اودھ کے دور آخر کی کل شاعری ان ہی کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھی۔

ولی :۔ ضرور بالضرور ان دونوں شاہان کو بلاؤ اگر وہ ہم فقیران بیچ بیٹھنا پسند کریں۔

آزاد :۔ مجکو تو یقین ہے کہ وہ بخوشی خاطر آئیں گے جب عالم اجسام میں جہاں دولت و فقر کا امتیاز تھا۔ انھوں نے مشاعروں کی محفل کو رونق دی تو یہاں! جو جگہ مادی اور جسمانی اسباب کی برتری اور کمتری کے حدود سے باہر ہے کیوں نہ شریک ہوں گے۔

شبلی :۔ اب ہم لوگوں کو اجازت ہو تو ہم رخصت ہوں اور انتظام مشاعرہ میں مشغول ہوں۔

ولی :۔ فی حفظ اللہ۔ (سب سے گلے مل کر رخصت کرتے ہیں)

تینوں آدمی واپس جاتے ہیں

دوسرا سین ختم ——————— پردہ گر جاتا ہے۔

سہ ایام البیض۔ لفظی معنی روزہائے روشن۔ یعنی چاند کے مہینے کی ۱۳-۱۴-۱۵ کی شب چاند غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک آسمان پر رہے۔ اس طرح دن بھر سورج کی روشنی اور رات بھر چاند کی روشنی۔ دن رات دونوں روشن ان تین دنوں کو ایام البیض کہتے ہیں۔

سین تیسرا

"مشورہ"

[وہی پہلا سبزہ زار ہے چشمے کے قریب ایک سفید پتھر کی اونچی سی سِل تپائی کی صورت میں پڑی ہوئی ہے تینوں آدمی ایک ہی طرف سے آتے ہیں اور سنگین تپائی پر بیٹھ جاتے ہیں]

شبلی :۔ لیجیے! مشاعرے کی تاریخ تو طے ہی ہو گئی اور فہرست شعراء بھی منظور ہو گئی اب چند اور مبادیات ہیں جو طے ہو جائیں تو پھر دعوے کو نکلیں۔

آزاد :۔ چند مبادیات کیا؟

شبلی :۔ مثلاً طرح۔ وقت مشاعرہ اور ترتیب نشست وغیرہ۔

آزاد :۔ میرے نزدیک تو قید طرح سے اس کو آزاد ہی رکھیے، ہر دور کے شاعر اپنی اپنی معرکۃ الآرا نظم جو ان کا شاہکار ہو اور جس میں شاعرانہ کمال سے زبان کی خدمت کی گئی ہو وہی پڑھیں۔

فرحت :۔ میرے نزدیک تو آپ کی رائے بہت صائب ہے نہ کوئی طرح مقرر کی جائے نہ کوئی خاص صنفِ نظم، بلکہ ہر استادِ فن اپنا اپنا بہترین شاہکار پیش کر دے۔

شبلی :۔ ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں تنوع بھی ہو گا اور "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا لطف ملے گا۔

آزاد :۔ رہا وقت کا تعین۔ تو "ایام البیض کی کوئی شب" جو حضرت نے

فرمائی ہے اس کا یہی مقصد ہے کہ مشاعرہ چاندنی رات میں ہو۔ آٹھ بجے
شام کا وقت۔ شب چہاردہم بدر کامل کی چاندنی جب کھیت کرے گی تو
اس سبزہ زار کی فضا میں اور چار چاند لگ جائیں گے۔ سفید سادہ فرش
ہوگا۔ دونوں شاہانِ مملکت دنیا اور تیسرے شاہ ملکِ معانی حضرت
ولی کے واسطے ایک مسند بچھا دی جائے گی یہاں عالم ارواح میں حقے
پان کا کیا کام۔

شبلی:- اچھا تو فہرست شعراء نکالئے اور کون کس سے وعدہ لے اس کو بھی
ابھی طے کر کے کام تقسیم کر لیا جائے۔

آزاد:- (جیب سے فہرست نکال کر پڑھتے ہیں) سودا، درد، حق، میر.....
اقبال، فانی، ثاقب، (مسکرا کر شبلی سے مخاطب ہوتے ہیں)
میاں نظیر[1] اور مرزا دبیر[2] سے تو آپ ہی وعدہ لیجئے گا نا؟

شبلی:- (مسکرا کر) مولانا الطاف حسین[3] حالی کے حوالے تو میاں نظیر کا وعدہ کر دونگا
وہ ان سے قریب تر ہیں۔ رہے مرزا دبیر ان سے جب وعدہ

---

[1] شبلی نے فصاحت و ابتذال کی بحث میں ایک مقام پر یہ لکھ دیا ہے "ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔" اسی کی طرف اشارہ ہے جو آزاد مسکرا کر شبلی سے کہہ رہے ہیں۔ (دیکھو موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۹۔ سطر ۱۲)

[2] شبلی پر "موازنہ انیس و دبیر" میں ہمدردان دبیر یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ شبلی نے تنقید کلام میں انیس کی جنبہ داری کی ہے اور دبیر کا پست کلام انیس کے بلند کلام کے مقابلہ میں پیش کر کے دبیر کو گھٹانے کی کوشش کی ہے اور یہی اعتراض آزاد کی آب حیات پر بھی کیا جاتا ہے کہ انیس کے یہ بھی جنبہ دار ہیں۔

[3] مولانا الطاف حسین حالی اپنی تحریر میں نظیر کو سب پر ترجیح دیتے ہیں حتیٰ کہ انیس تک پر!!!

لینے جاؤں گا تو آپ کو بھی لیتا چلوں گا۔ ہم دونوں ایک ہی عالم میں ہیں۔

آزاد :۔ میں اور آپ دونوں بھی تنقید کے بجرم اہل دنیا کی نگاہ میں ہوں تو ہوں مگر یہاں کی پاک فضا میں عالم آب و گل کا سا کثیف خیال کسی کو نہیں اور بقول استاد مرحوم

بیشِ دشمن نہ گزند ہے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل (ذوق)

شبلی :۔ اچھا تو یہ ہے کہ قدیم شعرائے دہلی سے آپ وعدہ لے لیں اور لکھنؤ بلکہ اودھ کو میرے ذمہ رکھ دیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ میرے عالم اسباب سے چلے آنے کے بعد یہاں آئے ہیں ان کے پاس ہمارے مرزا صاحب تشریف لے جائیں آخر یہ بھی تو وکیل ہیں۔ الثالث بالخیر۔

آزاد :۔ بہت مناسب ہے۔ مجھکو کچھ عذر نہیں۔ زبان و ادب کے واسطے میں نے دنیا میں بھی سب کچھ کیا یہاں بھی جو ہو سکتا ہے دریغ نہ کروں گا۔

فرحت :۔ میں تو آپ دونوں آدمیوں کا خردہ ہوں جو کام بتائیے کرنے کو تیار ہوں اور پھر یہ عالم مساوات ہے یہاں ہر شخص دوسرے شخص سے مل سکتا ہے اور جب ولی اللہ کا وکیل ہو تو "ایلچی کو کیا زوال"۔ "ع بر رسولاں بلاغ باشد وبس (جیب سے کاغذ نکال کر) لائیے میں اپنے ذمے کے نام لکھ لوں اور حضرت آزاد کے ذمہ جو نام ہوں وہ ان کے واسطے بطور یادداشت لکھ دوں۔

(فہرست نکلتی ہے فرحت اللہ کچھ نقل کر کے ایک پرچہ خود رکھ لیتے ہیں ایک پرچہ آزاد کو دیدیتے ہیں)
تینوں آدمی چلے جاتے ہیں

تیسرا سین ختم ——— پردہ گر جاتا ہے

سین چوتھا

سیر گاہ عالم ارواح

[ایک وسیع خودرو مرغزار کی صورت کا سرسبز میدان ہے جس میں جابجا درختوں کے کنج ہیں۔ سبزے کا ہرا ہرا رنگ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے۔ کہیں درخت ہیں کہیں فقط سبزے کا فرش ہے جا بجا چشمے ابل رہے ہیں کچھ دور پر ایک جھیل میں اجلا اجلا پانی چمک رہا ہے۔ اسی سبزہ زار کے ایک بہت دور کے گوشہ پر حضرت ولی اللہ کی وہی خانقاہ جو سین نمبر ۲ میں بھی دکھائی دے رہی ہے۔]

داخلہ :- میر تقی میر، آزاد، شبلی، حالی،

(۱) میر تقی میر ولی اللہ کی خانقاہ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

(۲) سیر گاہ کے جنوبی سرے پر کچھ فاصلہ پر نظیر اکبر آبادی زمین کی طرف آنکھیں گڑائے کھڑے کچھ غور کر رہے ہیں۔

(۳) ان کے بائیں ہاتھ کی طرف بالکل جنوب و مشرق کے کونے پر ایک پر فضا وسیع گوشے میں حضرت ظفر شاہ ایک بلند پتھر کے پہلو میں نہایت خوشنما پھولوں سے لدی ہوئی کیاری کے قریب تقریباً مستطیل پتھر کے ٹکڑے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اسی پتھر پر ذرا دور بادشاہ کی طرف منھ کئے ہوئے استاد ذوق تشریف فرما ہیں۔ ان ہی کے پہلو میں نواب مرزا خاں داغ جلوہ افروز ہیں۔

(۴) بالکل جنوبی حصہ میں ایک اور صاف ستھرا سبزے سے ڈھکا قطعہ زمین ہے جس پر ایک طرف چادر بچھی ہے مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں مومن ایک دوسرے کے روبرو اس طرح بیٹھے ہیں کہ غالب کا چہرہ مشرق کی طرف ہے تو حکیم صاحب کا دوسری سمت۔

(۵) ان سے ذرا فاصلے پر گوشۂ جنوب و مغرب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی کھڑے ہیں اور کچھ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی ٹہلنے لگتے ہیں کبھی ایستادہ رہتے ہیں۔

(۶) مغرب کی حد کے قریب وسط طول میں نہایت خوش رنگ پھولوں کے جھرمٹ میں ایک مشجر کی چادر بچھائے ہوئے میر انیس اور مرزا دبیر دوش بہ دوش رو بہ مشرق بیٹھے ہیں۔

(۷) شمال و مغرب کے کونے میں ایک پہاڑی کی سی شکل کے ٹیلے کی آغوش میں میاں انشا بالکل وارفتہ حالت میں با موئے پریشاں گلے میں توبڑا ڈالے دونوں پاؤں پھیلائے سر جھکائے بیٹھے ہیں ان کے سامنے میاں سعادت یار خاں رنگین اکڑوں بیٹھے ہیں۔ رنگین کبھی کبھی اپنے داہنے ہاتھ سے انشا کا بایاں بازو پکڑ پکڑ کر جھنجھوڑتے ہیں تو وہ کچھ گھبرا گھبرا کر بولنے لگتے ہیں۔ انشا کی آواز نہیں سنائی دیتی صرف لبوں کی حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ پھر اپنے عالم وارفتگی میں آنکھیں بند کر کے جھومنے لگتے ہیں۔

(۸) شمال کی طرف ہلکا سا سرخی مائل بادل اٹھا ہوا ہے جس میں کبھی کبھی کوندے

کے لٹکنے سے رنگ میں چمک اور سرخی میں شوخی پیدا ہو جاتی ہے
ایک رنگین پھولوں کی جھنڈی مثل روشن کے قطار در قطار
جس کے سامنے ایک چشمہ بہہ رہا ہے جس کے کنارے پر دو جل پری
دکھائی دیتی ہیں۔ اس تصویر کو نواب واجد علی شاہ اختر یوں
رہے ہیں کہ کمر تک تو پھولوں میں چھپے ہیں فقط کمر سے اوپر کا حصہ دکھائی دیتا ہے

(شمال و مشرقی گوشے سے میر تقی میر داخل ہوتے ہیں)

[میر تقی میر:۔ کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا
تھان پستولیے کا کمر سے بندھا ہوا۔ ایک پٹری دار رومال تہہ کیا
ہوا اس میں آویزاں۔ مشروع کا جوزی رنگ کا پائجامہ جس کے
عرض کے پائنچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی (اس کو لکھنؤ میں گھیتلا
جوتا کہتے ہیں) جس کی بالشت بھر کی اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف
دوسری طرف کٹار ہاتھ میں جریب (بد دماغی اور نازک مزاجی تیوری کے
بل سے ظاہر۔ پاس وضع اور تہذیب زمانہ پاؤں جا سے بے جا نہیں
رکھنے دیتی) میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، سفید ڈاڑھی
اوسط درجے کی مونچھیں، سر پر پٹے، سفید زیادہ سیاہ اکا دکا بال]

[کلام میں قنوطیت۔ درد۔ اثر۔ سادگی۔ حسن بیان، نفسیات
حسن و عشق سے ماہر، بہت طویل اور خفیف بحروں میں ایسے اشعار
نکالتے ہیں کہ دل پر نشتر کا کام دیں۔ ان کا کلام "آہ" غزلوں
کے بادشاہ۔ مثنویاں بھی خوب کہیں۔ قصیدہ میں سودا سے پیچھے

رہے مگر واسوخت کے موجد ہوئے۔ صاحب تذکرۂ شعراء بھی ہیں۔ ان کے "بہتر[۷۲] نشتر" مشہور ہیں مگر وہ بہتر[۷۲] اشعار سات سو بیس[۷۲۰] سے کم نہیں۔ ان کے آٹھ دیوان ہیں۔ متعدد مثنویاں۔]

میر تقی میر نہایت خراماں رفتار سے بجائے اس کے کہ کسی سبزہ زار یا کنج گل میں سیر کرنے کا تہیہ کیے ہوں حضرت ولی کی خانقاہ کی طرف بڑھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

گفتگو پہلی

ولی کی خانقاہ میں

(ولی اپنی خانقاہ میں مصلے پر بیٹھے ہیں۔ سامنے سے میر آتے ہیں۔)

میر:۔ سلام علیکم!

ولی:۔ وعلیکم السلام! خوش آمدید! صفا آوردید!!

(باہم مصافحہ ہوتا ہے پھر اٹھ کر بغلگیر)

ہمن توں تمہارے یوں درسن کے متمنی رہے اچھے

میر:۔ بندہ توں نت قدم بوسی کی خاطر ندان حاضر خدمت ہوا ہی کرے ہوں۔ ابھی چہار پنج یوم بھی نہ بیتے ہوں گے کہ قدم بوسی سیلتی مشرف ہو سکے چکا ہوں۔

ولی:۔ تم نے نت جگ منے ریختہ بھیتر، ہمن کین تتبع کی۔ اب یوہ عالم ارواح

بیچ ہمن کا سنگھ دیجیو۔

میرؔ:۔ بندے کو نت اس بات اُپر فخر حاصل ہے کہ آپ کے کلام سیتی فیض اٹھا ہے اور بندہ بذان آپ ہی کا ساتھ دوں گا۔

ولیؔ:۔ فی الحال ریختہ گویان عالم کے طرز بھیتر عجیب طرفہ تلاطم مچ رہی اے ہمن کوں یوہ کا علم آزاد۔ شبلی ہور ایک نو وارد کے بچن سون بھ سو یوہ کا تدارک بذریعہ یک مشاعرہ تجویز ہوا، ہمن ان ہر سہ کو اپن وکیل گردان اجازت دیا کہ مشاعرہ یوہ میدان بھیتر منعقد ہو لازمی ٹھرایا جائے تاکہ ہمن صاحبان طرز ریختہ اپن اپن بچن سون فضائے عالم کوں معمور کردیں۔ پس سیزدہم [۱۳] ماہ حال کوں واہ شاعرہ میں تمکوں تنک مغرب بعد شریک ہونا اچھے۔ مجھ ساتھ چلنا ہو مخصوص اپ ڈھنگ کا ریختہ سنانا۔

میرؔ:۔ نت انسب ہے۔ اگر جناب والا کا حکم ہے توں بندہ ضرور بالضرور ہو کر شرفِ معیت کوں حاصل کروں گا یہ موقع مغتنم ہے۔

ولیؔ:۔ جس ریختہ کوں ہمن ایام طفولیت منے اپن لُہو سون سِیدن پرداش کی سو وہ اب سنسار سوں میٹ جانے کو پہنچ جائے اچھے۔ البتہ یو مشاعرہ تنک واہ کی جتن سدھار دے۔

میرؔ:۔ بندے نے بھی اس ہی بولی اور اس ہی ریختے کی درستی و سبھاو کے کارن نت جگر کاوی کری ہے اور اس کی بہتری کے واسطے ہر ملال کو سہا۔ اب اس کو بربادی سیتی بچاوے کے خاطر درگاہ رب العزت میں

ٹک آپ بھی دعا فرمائیں اور بندہ بھی۔

(دونوں بزرگ ہاتھ اٹھا کر رو رو دعا کرتے ہیں)

(پردہ گر جاتا ہے)

گفتگو دوسری

نظیر (اکبر آبادی) حالی (پانی پتی)

(دوسرے گوشہ سے آزاد و شبلی ٹہلتے ہوئے آتے دکھائی دیتے ہیں۔ مشرق سمت جہاں نظیر کھڑے دکھائی دیتے ہیں وہاں تک ان کے ساتھ ساتھ حالی بھی ہیں۔

داخلہ :۔ آزاد، شبلی، حالی (بیچ میں شبلی۔ ایک طرف آزاد دوسری طرف حالی۔)

شبلی :۔ (حالی سے) لیجئے میاں نظیر وہ سامنے کھڑے ہیں۔ آپ ابھی ان سے یہیں گفتگو کر لیجئے۔ ہم لوگ ذرا اس طرف ہو لیں۔

حالی :۔ میں ان سے بات کر کے چلا جاؤں گا، آپ سے پھر مل کر کہوں گا کہ کیا جواب دیا۔

آزاد :۔ دیکھئے مولانا اصل داعی اس مشاعرے کے حضرت ولی اللہ ہیں دعوت ان کے نام سے دیجئے گا!

حالی :۔ جی ہاں! میں سمجھ گیا۔ آپ لوگ ان سے بچنا چاہتے ہیں۔ میرا تو خیال ہو کہ وہ پہلو تہی نہ کریں گے۔

(حالی نظیر کی طرف سے چلے جاتے ہیں۔ شبلی و آزاد آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کچھ

دو دو چل کے شبلی تو سیدھے امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ آزاد ذوق کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھتے ہیں)

[نظیر اکبر آبادی :- ۱۱۵۱ھ / ۱۷۴۰ء بمقام اکبر آباد - پیدائش - بعمر ۹۰ سال ۱۲۴۱ھ / ۱۸۳۰ء اکبر آباد میں انتقال کیا۔]

(نوٹ :- بلحاظ عمر ان کا شمار کئی دوروں میں پڑتا ہے۔ مگر بہ لحاظ شاعری اُن کا خاص رنگ ہے)

درمیانی قد۔ اوسط درجے کا جسم - برہنہ پا - گیروی تہمد اور لمبا قلندرانہ دلق (دلق کی صورت یہ ہے کہ آگے پیچھے دو دامن کرتے کے دامن کی طرح۔ اگلے دامن میں چھوٹا سا گریبان۔ پہلوؤں میں آستینیں یوں لگائی گئی ہیں کہ مونڈھے سے کہنی تک لمبا ایک کپڑا ٹکا ہوا ہے جو نیچے کی سیون پر سے کھلا ہوا ہے۔) اس دلق کے دامن اور آستینوں کا کناروں اور مونڈھے کی سیونوں پر زرد چار خانے کے کپڑے کی پٹی بطور گوٹ کے چار انگل چوڑی ٹکی ہے۔ اس کپڑے کی زمین زرد ہے چار خانہ نیلے رنگ کا ہے ہر خانے کے اندر ایک نیلا گول دھبا ہے۔ سر پر مخروطی شکل کی ٹوپی جیسے بڑی سی برف کی قفلی۔ نوک پر پھندنا کناروں پر گوٹ۔ ٹوپی کا رنگ سیاہ۔ سفید کپڑے کے بیل بوٹے اوپر سے ٹکے ہیں۔ کان میں داہنی طرف ایک تسبیح لٹک رہی ہے۔ ایک تسبیح گلے میں پڑی ہے۔ ایک ہزار دانہ داہنے کاندھے سے بائیں پہلو کی طرف لٹک رہی ہے، دونوں ہاتھوں میں زرد زرد رنگ

ئے موٹے موٹے کہربا کے دانوں کی سمرنیں۔ بائیں ہاتھ میں ایک مازیج کی لکڑی (جیسے موٹی سی بیل کسی درخت پر خم درخم چڑھ کر خشک ہو جائے) جس کا موٹا سرا ہاتھ میں پتلا سرا اسی طرف کے کاندھے پر رکھا ہے ایک سیاہ کمبل تہ کر کے لمبا لمبا شانے پر آدھا ادھر آدھا ادھر آگے پیچھے ڈال لیا ہے اسی کمبل پر لکڑی ٹکی ہوئی ہے۔

چہرے پر داڑھی ندارد صرف بڑی بڑی مونچھیں سفید ہیں جو اسی صورت میں ہیں جس طرح اللہ نے پیدا کی تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہے۔ سر پر پٹے ہیں جو داہنی طرف جھکی ہوئی ٹوپی کے نیچے سے دکھائی دیتے ہیں]

[الطاف حسین حالی:۔ گول چہرا، گورا رنگ، بہت سو تواں ناک، بڑی بڑی شن آنکھیں۔ کشادہ بلند پیشانی۔ زیادہ سفید اور بہت کم سیاہ ڈاڑھی ، کنگھی سے برابر کی ہوئی، بڑی بڑی سفید مونچھیں جو ڈاڑھی سے پیوست۔ پر سیاہ مخمل کی گول ٹوپی، سرمئی شیر دانی، سفید اوسط کی مہری کا پجامہ۔ دلی والا جوتا۔ گلے میں سفید گلوبند]

خلہ حالی:۔ میاں صاحب۔ السلام علیک۔

ظیر:۔ وعلیکم السلام! بابا خوش رہو۔

لی:۔ آپ کی دعا سے بہت خوشی سے گذری مگر اب غم روزگار نے ستایا ہے۔ اسی اپنی خوشی بھی فراموش ہو گئی۔

۔ حالی کے تفصیلی حالات سین نمبر (۶) میں جب یہ مشاعرہ میں پڑھتے ہیں وہاں ملیں گے۔

نظیرؔ :- (تعجب و حقارت کے لہجہ میں) "غم روزگار"؟ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ"

حالیؔ :- ہم کو یہاں عالم ارواح میں دنیا کا غم نہیں ہے بلکہ اہل دنیا کا۔

نظیرؔ :- دنیا تو اہل دنیا ہی کو کہتے ہیں!

حالیؔ :- اہل دنیا کو جو ہم سپرد کر آئے تھے اسی کا غم ہے۔

نظیرؔ :- کیا سپرد کر آئے تھے؟ مال و زر! جاہ و دولت؟ سو اس کا کیا غم۔ جو آپ سے گیا وہ جگ سے گیا!

حالیؔ :- جاہ و مال کا غم نہیں ہے۔ اپنے بزرگوں کی میراث۔ زبان۔ تہذیب طرز معاشرت مٹ رہی ہے۔

نظیرؔ :- ہائے یہ کیا کہے ہو؟ ارے اس ہی تہذیب اور زبان کے کارن ہم نے اپنے تئیں کو مٹیا۔ کہ یہ نہ مٹے۔ نت عوام سے سروکار رکھا۔ ان کو ہی سدھار ہنسی ہنسی میں نصیحتیں کیں۔ کڑوی کسیلی دوائیں ہنسی کی مٹھائی ملا کر عوام کے حلق میں اتار دیں۔ خود بدنام ہوئے۔ اونچے لوگ نیچی نگاہ سے دیکھنے لگے ہم اپنی دھن میں لگے رہے سو کیا اب وہ ہی مٹ جائے رہی ہے۔

حالیؔ :- جی ہاں وہی اردو زبان جس کو وسیع بنانے کے لئے آپ "عوام کے شاعر" کہلائے اب دم توڑ رہی ہے!!

نظیرؔ :- سو بابا ہم تو ٹھہرے فقیر۔ درویش، جو کہو سو کریں، ہم سے کیا ہو سکے ہے؟

حالیؔ :- ایک مشاعرہ حضرت ولیؔ نے اب کی چاند کی تیرھویں کو بعد مغرب شب چہار دہم کیا ہے اس میں شرکت کیجئے۔ یہ زبان کی درستی اور تہذیب نشست

درخواست کی اصلاح کے واسطے کیا گیا ہے۔ وؔلی کی خانقاہ کے پشت کے میدان میں آئیے گا۔

نظیرؔ:۔ ولی اللہ تو ریختے کے بڑے زبردست استاد ہیں، ہم تو غزل بہت کم کہتے ہیں ہم مشاعرے میں کیا کریں گے؟

حاؔلی:۔ جی نہیں! وہاں غزل پڑھنا لازمی نہیں ہے۔ بلکہ ہر صنف کلام پڑھی جائیگی۔ آپ اپنا "بنجارے نامہ" پڑھیے گا یہی کہا گیا ہے۔

نظیرؔ:۔ تو بابا پھر ہم ضرور آویں گے۔ حضرت وؔلی کا حکم کہیں مل سکتا ہے؟

حاؔلی:۔ تو پھر میں رخصت ہوتا ہوں۔ فی امان اللہ۔

(حالی تو چلے جاتے ہیں نظیر اسی عالم سکوت میں کھڑے رہتے ہیں)

گفتگو تیسری

آزاؔد، ذوقؔ، ظفرؔ شاہ اور داغؔ سے

[آزاد ظفر شاہ اور ذوق کے قریب پہونچتے ہیں بادشاہ کو ادب شاہی سے کورنش بجالاتے ہیں اور اپنے استاد ذوق کو مؤدبانہ سلام کرتے ہیں۔ نواب مرزا خاں داؔغ دہلوی سے برادرانہ سلام کے بعد مصافحہ و معانقہ ہوتا ہے۔]

[بہادر شاہ ظفر۔ مرزا ابوالمظفر۔ سراج الدین محمد بہادر شاہ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے ۱۸۵۷ء میں معزول ہوئے

۱۸۶۲ء میں بہ شہر رنگون ملک برہما میں ۴ چار سال قید رہ کر، ۸۰ سال کی عمر میں قید فرنگ اور قید نجات دونوں سے نجات پاگئے۔

میانہ قد۔ بہت نحیف جسم۔ چہرہ کسی قدر لمبا۔ آنکھیں بہت بڑی اور چمکدار۔ آنکھوں کے نیچے کلوں کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی دانتوں کا چوکا ذرا ابھرا ہوا۔ گردن لمبی سڈول، باریک ستواں ناک، کشادہ دہانہ، گہری سانولی رنگت، ڈاڑھی کلوں پر چھدری چھدری بہت کم ٹھوڑی پر ذرا گھنی، کتری ہوئی مونچھیں، ڈاڑھی مونچھوں کے بال بالکل سفید، مقیش کے لچھے، سر منڈا ہوا، چہرے کی جھریاں پیرانہ سالی کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن گفتگو میں آواز کا کرارہ پن موجود ہے۔ کمخواب کے زرد رنگ کا ایک بڑے پائینچے کا پائجامہ۔ نیچا سفید ململ کا کرتا۔ اس پر جامدانی کا انگرکھا۔ اس پر سے جامہ وار کی خفتان۔ کارچوبی سبز رنگ کی چو گوشیہ ٹوپی ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول لئے ہوئے ہیں جس کو کبھی کبھی سونگھ لیتے ہیں۔

شاعری کے بڑے دلدادہ۔ بہت اچھے خوش نویس۔ بہت ضخیم کلیات۔ ۴ دیوان چھوڑے۔ ارباب نشاط انھیں کی غزلیں زیادہ گاتی تھیں۔ قید میں بھی شاعری کرتے رہے۔

[شیخ ابراہیم ذوق :۔ متوسط قد و قامت۔ اچھا خاصا سانولا رنگ چہرے پر چیچک کے بہت داغ۔ روشن بڑی بڑی آنکھیں جن سے تیز تیز نگاہیں نکل رہی ہیں۔ کھڑا نقشہ۔ سفید رنگ کا تنگ مہری کا پائجامہ

سفید انگرکھا سر پر گول چندوے کی سفید مندیل جس کی دیوار پر وسط میں ایک بیل ٹنکی ہوئی۔]

(آزاد سلام کرتے ہیں)

ذوق:۔ (شفقت و محبت کے لہجے میں) وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ

بادشاہ:۔ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) وعلیکم۔

آزاد:۔ (داغ سے خلوص و محبت کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ جب حالی رخصت ہو جاتے ہیں تو آزاد سے گفتگو ذوق سے شروع ہوتی ہے۔)

(ذوق سے دست بستہ) قبلہ و کعبہ! حضرت ولی نے مجکو مامور کیا ہے کہ میں خدمت اقدس میں عرض کر دوں کہ حضرت نے ایک مشاعرہ شب چہاردہم بعد مغرب کے منعقد کیا ہے جس میں آنجناب کی شرکت ضروری متصور کی جاتی ہے۔ نیز یہ بھی عرض کر دوں کہ بوجہ اپنی پیرانہ سالی اور اعتکاف نشینی کے وہ خود معذور تشریف آوری ہیں، جناب والا ان کی طرف سے درگاہ بندگان عالی حضرت ظلِ الٰہی میں عرض کر دیں کہ جس طرح شعرائے دورِ آخر دہلی کی سرپرستی بندگان عالی نے عالم اسباب میں کی اس مربیانہ نظر سے حضور پُرنور شعراء کی سرپرستی اسی عالمِ ارواح میں بھی فرمائیں اور کلام الملوک ملوک الکلام سے مستفیض کریں۔

ذوق:۔ میاں آزاد! یہ تو بتاؤ کہ اس مشاعرے کا محرک کیا سبب ہوا جو اتنی مدت طویل کے بعد یہ خیال پھر پیدا ہوا۔

آزاد:۔ استاد! دور حاضر کے شعراء نے اپنے طرز و سبک کو اشعار میں اور اصول

علم مجلس کو معاشرت میں کچھ ایسا بدل دیا ہے کہ حضرت موصوف کا خیال ہے کہ ہم سب خدمت گذاران ادب و تہذیب کی صدہا سال کی کوشش اور عرق ریزیاں جو اس امر خاص کے واسطے ہوتی آئی ہے کہیں کالعدم نہ ہو جائیں۔

ذوق :۔ کیا فی الحقیقت یہی حالت ہو گئی ہے ؟ افسوس !!

آزاد :۔ قبلہ ! یہ حالت تو بہت عرصہ سے شروع ہو گئی تھی لیکن امید یہ تھی کہ شاید زمانہ کوئی کروٹ لے اور اس کا نعم البدل ہو جائے۔ لیکن آج کل عالم اسباب سے آنے والے لوگوں کی زبانی جو چشم دید گواہ ہیں یہ معلوم ہوا کہ دنیا زوال کی طرف ہماری شاعری کو لئے جارہی ہے۔ تو قرائن تو یہ ہیں کہ ہم لوگوں کو بھی یہاں چین سے بیٹھنا نظر نہیں آتا، استادگرامی الہامی شعر کہا تھا جو اب بار بار یاد آتا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حضرت ولی اللہ کا خیال ہے کہ یہ ہم لوگوں کا فرض ہے کہ فضائے عالم کو ایک بار پھر ہم لوگ، اپنی آوازوں سے معمور کر دیں کہ بری تموّج ہوا اسکے اثرات کو عالم آب و گل میں ساری کر دے۔

ذوق :۔ ہاں بھئی ولی پھر ولی ہے ..... خیال تو اچھا ہے اور میں تو ضرور دکنی کی آواز پر لبیک کہوں گا۔ دیکھو ! حضرت بادشاہی میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ (بادشاہ کے ذرا قریب بڑھ کر دست بستہ) حضرت پیر و مرشد نے ولی اللہ

کا پیغام سماعت فرمایا؟

ظفرؔ:۔ (ایک آہ سرد بھر کر) میں نے سُنا۔ وہ سُنا جس کے سننے کی اُمید نہ تھی۔ افسوس! سلطنت تو مٹی ہی تھی۔ عزت و ناموس تو برباد ہوئی تھی اے کاش بزرگوں کی یہ یادگار باقی رہ جاتی۔ کاش ہم اسلاف اپنے اخلاف ہی کی طرف سے خوش و مطمئن رہتے کہ ہماری ودیعت کو انھوں نے مٹنے نہ دیا سو وہ بھی نہ ہوا۔ افسوس!!

ہمارا نام ہمارے بزرگوں کی عزت کس نے مٹائی ہماری اولاد نے۔ میاں ابراہیم! سلطنت جاہ و عزت دولت و ثروت غیروں نے سمندر پار سے آنے والوں نے لوٹی مگر افسوس! وہ دولت بیدار جس کو برقرار رکھنے کے لئے ہم سلطنت پر ٹھوکر مار کر ناز کرتے تھے اسی کو ہمارے بچوں نے ہمارے گوشت پوست نے برباد کیا! افسوس!!

بھئی میں ضرور چلوں گا اور ہر بات اس مصیبت کو کاٹنے کے لئے کروں گا۔ مجھے تو بڑا فکر ہو گیا۔ ہائے کیا غضب ہوا افسوس! (پھول پھینک کر دونوں ہاتھ ملتے ہیں) افسوس!!

ذوقؔ:۔ بس میاں! تم حضرت ولیؔ کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور میری طرف سے سمعاً و طاعتاً کہہ دینا۔ اور حضرت ظل الٰہی کی زبان معجز بیان سے جو تم کو شرف سماعت ہوا ہے وہ بھی کہدینا۔ خدا حافظ۔

آزادؔ:۔ (داغؔ سے مخاطب ہو کر) بھائی نواب مرزا! استاد کے ساتھ آپ بھی ضرور ضرور آئیے گا دیکھئے فراموش نہ کیجئے گا۔

داغ :- بھائی صاحب! بھلا آپ کا حکم کہیں ٹل سکتا ہے۔

(آزاد سب کو تسلیم کر کے رخصت ہوتے ہیں)

گفتگو چوتھی

امیر مینائی و محسن کاکوروی سے شبلی کی ملاقات

داخلہ :- شبلی (امیر و محسن کو سلام کر کے کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں تا آنکہ آزاد اور ذوق کی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔)

[امیر احمد امیر مینائی :- بہت گورا رنگ جو پیرانہ سالی کی جھریوں پر بھی چمک رہا ہے۔ چہرہ ذرا لمبا ہے لیکن داڑھی کے طول نے اس کی نصف لمبائی کو ڈھانک لیا ہے۔ خضاب بالکل نہیں کرتے۔ سفید داڑھی ہے ایک آدھ بال جا بجا سیاہ ہے لب تراشی ہوئی مونچھیں، داڑھی میں پیوستہ ہو گئی ہیں، شرعی صورت میں ہونٹوں پر سے کٹی ہوئی۔ کشادہ پیشانی بڑی بڑی آنکھیں۔ عالمانہ پگڑی جس نے کانوں کو اتنا ڈھنکا ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ سر پر پٹے ہیں یا خشخاش بال۔ سفید اچکن کرتوئی دار اس پر سیاہ عبا، شرعی اُٹنگا پاجامہ۔ بے جراب کا سلیم شاہی جوتا، چہرے پر متانت و سنجیدگی، صوفی سیرت و عالمانہ صورت۔]

[مولوی محمد محسن کاکوروی :- میانہ قد، گندمی رنگ، چہرے پر چند

داغ چیچک کے لیکن بہت خفیف غور سے دیکھنے پر دکھائی دینے والے چہرہ گول۔ بے خضاب کی سفید شرعی داڑھی سیاہی بہت کم نہایت متین وسنجیدہ۔ نرم آواز، بایاں ہاتھ ذرا بمشکل اٹھتا ہے۔ خندہ پیشانی، سفید کرتا، سفید مہین اچکن، سفید پائجامہ اور سفید چغا۔ سر پر سفید پگڑی۔ پاؤں میں مخملی پمپ زرد رنگ کا۔]

(آزاد کی گفتگو ختم ہونے پر بلند آوازے)

شبلی:- (امیر و محسن سے) ...... اسی خاص غرض سے میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ولی نے مولانا آزاد کو مرزا فرحت اللہ بیگ کو اور اس ناچیز کو اپنا وکیل مقرر کر دیا ہے ان کے بجائے ہم لوگ سب سے وعدہ لیتے ہیں۔ اسی واسطے میں حاضر ہوا ہوں۔ وہ دونوں حضرات دیگر شعراء کے پاس علیحدہ علیحدہ گئے ہیں، محفل مشاعرہ بعد مغرب شب چہار دہم ماہ حال منعقد ہو گی۔

امیر:- کیوں حضرت! کسی مخصوص زمانہ یا مقام کے شعراء مدعو ہوئے ہیں؟ اور طرح کیا ہے؟

شبلی:- نہیں جناب! کسی مخصوص عہد یا مقام کے شعراء نہ کسی خاص زمانے یا شہر کے بلکہ ہر عہد کے اور ہر صنف کلام کے اساتذہ جنھوں نے اپنے کلام سے اردو نظم کی مدت کی ہے۔ ان کو مدعو کیا گیا ہے طرح کے واسطے حضرت نے فرمایا ہے کہ ہر استاد وہ غزل یا نظم جس میں اس نے اپنی خصوصیت خاص سے خدمت۔ زبان کی ہو اور صنعتِ حسنِ بیان کی داد دی ہو سنائے گا۔

محسنؔ :۔ مولانا میں نے تو ہمیشہ غزل پر نعت کو ترجیح دی اور نعت، منقبت ہی سے
خدمتِ دین کی۔ میری وہاں کیا ضرورت ہو گی کہیئے تو بطور سماعت کنندہ
حاضر ہو کر صف سامعین میں بیٹھ جاؤں؟

شبلیؔ :۔ تو پھر یہ کوئی معمولی خدمت ہے! آپ تو "مداحِ رسولؐ ہیں"۔ آپ نے
نعت کے میدان میں بہت گل کاری کی، وہی ارشاد کیجئے گا۔ ع

"سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل"

حضرت آپ کا یہ قصیدہ مقبول دربار نبوی صلعم ہے۔

محسنؔ :۔ (فرط مسرت سے رو کر) اے زہے نصیب جو ایک شعر بھی مقبول بارگاہ
رسالت ہو جائے۔ مگر حضرت! غزل اور قصیدے کا کیا ساتھ؟

شبلیؔ :۔ جی نہیں! غزلیں وغیرہ جب پڑھی جا چکیں گی تو پھر "خیر الاذکار"
ہو گا، تاکہ یہ صحبت برکت پر ختم ہو۔

محسنؔ :۔ بہتر ہے! انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔

امیرؔ :۔ میں بھی ضرور بالضرور کسب شرف دلی اللہ کروں گا۔

شبلیؔ :۔ (اٹھتے ہوئے) اچھا! اب تخفیف تصدیع۔ (کھڑے ہو کر سلام کرتے
ہیں)

محسنؔ و امیرؔ :۔ وعلیکم السلام۔ فی حفظ اللہ

شبلیؔ :۔ فی امان اللہ (رخصت)

گفتگو پانچویں

مومن و غالب سے آزاد کی ملاقات

[غالب۔ مرزا نوشہ۔ اسد اللہ خاں۔ قد اونچا چوڑے چکلے ہاڑ گوڑ کے ترکی النسل موٹا نقشہ بڑے کلّے ٹھلّے کے سرخ و سفید چمپئی رنگ کے ۷۲۔۷۳ برس کی عمر کے آدمی۔ بڑھاپے نے کسی قدر سرخی پر زردی نمایاں کر دی ہے آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں داڑھی خوب بھری بھری ہے گو بہت لمبی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا۔ سیاہ پوستین کی ٹوپی، (قلپاق) ایک بر کا سفید پائجامہ۔ سفید ململ کا انگرکھا، نیچے سفید مہین کرتا]

[حکیم مومن خاں مومن:۔ کشیدہ قامت، بہت سانولا رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، گھنی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، پان کی دھڑی جمی ہوئی۔ دانتوں میں مسی لگی ہوئی، ہلکی ہلکی پتلی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پہ لمبی کاکلیں، کچھ بال پشت پر کچھ کندھوں پڑے ہوئے۔ کانوں کے قریب تھوڑے سے بالوں کی زلفیں بنائی ہیں۔ بغیر کرتے کا سفید ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا جسم کا کچھ حصہ انگرکھے میں سے دکھائی دیتا ہے۔ گلے میں سنہری تعویذ سیاہ ریشمی فیتہ سے بندھا ہوا۔ اودے رنگ کا مہین دوپٹہ بٹ کر کمر میں لپیٹ لیا ہے جس کے دونوں کونے سامنے لٹک رہے ہیں، سرخ رنگ کے ساٹن کا تنگ

مُہری کا پائجامہ جس میں شال باف کا نیفہ ہے۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے ذرا کھلی ہوئی ہیں جس کو کلائی پر الٹ لیا ہے۔ سر پر گلشن لوٹ کی دوپلّی ٹوپی جس کے کنارے پر باریک ریشمی بیس، ٹوپی سر پر منڈھی ہوئی مانگ کا کچھ حصہ اور ماتھا کھلا ہوا ہے۔ ہاتھ میں پیتل کا پشت خار]

داخلہ:۔ آزاد (غالب و مومن کو) سلام علیکم۔

غالب و مومن:۔ وعلیکم السلام۔ مزاج مبارک؟

آزاد:۔ الحمد للہ رب العالمین۔

(غالب سے) استادِ محترم! میں حضرت ولی کا پیام لے کر شرف حضوری حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔ شب چہاردہم ماہ حال بعد مغرب ایک مشاعرہ بے طرح۔ عقب خانقاہ حضرت ولی منعقد ہوا ہے جسمیں جناب والا اور جناب حکیم صاحب (مومن کی طرف اشارہ کرکے) کی شرکت بہت ضروری ہے۔

غالب:۔ مجھے اس مشاعرے کی اطلاع تو پہلے سے ہے۔ بلکہ ابھی خاں صاحب سے میں یہی ذکر کر رہا تھا کہ تم آگئے، کل میں میرؔ صاحب سے ملنے گیا تھا۔ انھوں نے اس مشاعرے کا ذکر کیا اور جو باعث اس کے انعقاد کا ہے وہ بھی مجملاً بیان کیا۔ مگر اس بیان میں ان کو گریہ گلو گیر ہوا اور میں نے زیادہ دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا، کیا فی الحقیقت اہل دنیا نے ہم لوگوں کے طرز کو بالکل پس پشت ڈالدیا؟ افسوس!!

آزاد:۔ جی ہاں استاد! آپ تو تلمیذ الرحمٰن تھے اور حقیقتہً آپکے اشعار

"نوائے سروش" ہیں آج کل کے شعراء تو بالکل آپ کے اس شعر کے مصداق ہیں کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

آپ کی یہ آرزو بر آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

غالب :- بھئی یہ تو محض ایک قیاسِ شعری تھا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ امر فالِ زبان ہو جائے گا۔ میاں یا تو ایسے شعر کہنے والے سودائی ہیں یا پسند کرنے والوں کی عقل کا فتور ہے۔!

داغ :- جناب عالی! صورت واقعہ مختصراً یہ ہے کہ کہنے والے ایک خاص "جہل مرکب" کے مریض ہیں اور سننے والے ہمہ دانی اور شعر فہمی کے ادعا میں خواہ سمجھیں خواہ نہ سمجھیں اظہار سخن شناسی کرتے رہتے ہیں۔

ذوق :- میں تو بغیر طرح کے مشاعرے کا کبھی قائل ہی نہ تھا اور یہی میں ابھی مرزا صاحب سے کہہ رہا تھا کہ تم آگئے۔ لیکن اس صورت حال میں تو ہم لوگوں کو چاہیئے ہے کہ ان کے اصلاح مذاق کے واسطے ان کو خوب ہی بے طرح سنائیں!

داغ :- (مسکرا کر) جی ہاں آپ لوگ اساتذہ ہیں۔ حک و اصلاح تو در اصل آپ ہی لوگوں کا کام ہے۔ ہم لوگ تو سقم و عیب دکھا دیتے ہیں اصل اصلاح کرنا اور سدھارنا تو آپ ہی کے شایان شان ہے۔ حضرت ولی استاد الاساتذہ ہیں ان کا پیام پہنچانا ہم لوگوں کے ذمہ ہے۔ ؎

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

غالب:۔ ارے میاں تم دلّی کے دکیل ہو۔ ہمارے نزدیک بھی تم نیم ولی ہو۔ ولی کا پیام اور ایک سیدزادہ کی زبانی انکار کر کے کون منکر ایمان بنے دربھتیجا یہ (مومنؔ کی طرف اشارہ کر کے)، تو ٹھہرے مومن یہ کہیں ولی اللہ کے حکم سے باہر ہو سکتے ہیں؟

مومنؔ:۔ بھئی میں مرزا نوشہ کے ہمراہ ضرور آؤں گا۔ ولی اللہ کی خانقاہ کے طواف کو جب ان (غالب) کے ساتھ چلوں گا تو اپنا یہ شعر پڑھتا ہوا جاؤں گا۔

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر ‏ ‏ ‏ مومنؔ چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

آزادؔ:۔ (آداب کر کے) اچھا! اب اجازت ہے؟ خدا حافظ

(سلام کر کے چلے جاتے ہیں)

گفتگو چھٹی

مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ سے شبلیؔ و آزادؔ کی ملاقات

جب غالبؔ و مومنؔ سے رخصت ہو کر آزادؔ چلے تو وہیں پر شبلیؔ ٹہل رہے تھے جو ابھی امیرؔ و محسنؔ سے وعدہ لے کر آئے تھے۔ دونوں آدمی ایک ساتھ انیسؔ و دبیرؔ کے پاس جاتے ہیں۔

[میر ببر علی انیسؔ:۔ کھلتا گندمی رنگ۔ کشادہ پیشانی، متوسط موزوں قد۔ سر پہ پٹے۔ جو کان کی لَو سے ذرا نیچے ہیں۔ ورزشی ہاتھ پاؤں بھرے

بھرے بازو۔ بڑی اور خوش نما مونچھیں جو بہت گھنی ہیں اور جنکی دونوں نوکیں نصف رخساروں تک بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اوپر کے ہونٹ کا کنارہ مونچھوں سے کھلا ہوا۔ داڑھی صاف مونچھوں پہ بہت صاف خضاب کیا ہوا۔ ایسے ہی بال سر کے۔

سفید ململ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا گریبان بائیں طرف مگر اتنا چھوٹا کہ ایک گھنڈی تکمہ (جس کو عاشق دمشوق کہتے تھے) سے بند ہو جائے گلو کے نیچے ایک کپڑے کا چاند (کنٹھا) بجائے گوٹ کے لگا ہے۔ گلے میں پکن کی بیل مثل ہار کے کڑھی ہے عرض کا پائنچہ ایک کلی لگی ہوئی۔ پائجامہ جوزی رنگ کے مشروع کا۔ لکھنو کی پچگوشیہ ٹوپی پر چڑھی ہوئی کرتی کی آستینیں خوب چنی ہوئیں، پاؤں میں گھیتلا جوتا زردوزی کنی کا سچے کام کا (فرش کے کنارے)]

[مرزا سلامت علی دبیر:۔ گول چہرہ، لمبا قد، متوسط ڈیل ڈول، اچھا خاصا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، گول آنکھیں، شرعی مونچھیں، خضاب لگا ہوا کچھ جڑیں کھلی ہوئی، سر پر پٹے جس کے سرے کانوں کی لو دن سے اونچے۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ سر پہ لکھنؤ کی پیچ گوشیہ ٹوپی قالب پر چڑھی ہوئی، سفید مہین کرتا۔ اس کے اوپر سفید انگرکھا جامدانی کا۔ اودے رنگ کے مشروع کے بڑے بڑے پائنچوں کا پائجامہ۔ اوپر سے جالی کا تکونا رومال اوڑھے ہوئے ہیں۔

علہ:۔ آزاد و شبلی۔

آزاد و شبلی:۔ تسلیمات۔ آداب عرض ہے!

انیس و دبیر:۔ (ذرا بلند ہو کر تعظیم) آداب ہے۔ تسلیمات عرض۔ آئیے آئیے تشریف لائیے۔

(دونوں آدمی وکیلوں سے مصافحہ کرتے ہیں اسی قالین پر ایک طرف دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

شبلی:۔ ہم دونوں آدمی حضرت ولی کے فرستادہ آپ حضرات کی خدمت میں ایک مشاعرے میں تشریف آوری کی زحمت دینے کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔ اگر حضرت ولی کی دعوت جنابِ والا قبول فرمائیں تو مشتاقانِ کلام عالی کے واسطے اعلان اسم گرامی کیا جائے۔ بغیر حصول اجازت[1] جناب والا ہم لوگوں کو اتنی جسارت نہیں کہ جناب کی ذاکری کا اعلان کر دیں۔

---

[1] میر انیس مرحوم بڑے غیور طبع آدمی تھے اگر ان سے اجازت کے بغیر کوئی مشہور کر دیتا کہ وہ پڑھینگے اس کے یہاں ہرگز نہیں پڑھتے تھے ——— شاہی میں ایک نواب بندہ مہدی خاں تھے جو سرکار اودھ میں بہت رسوخ رکھتے تھے انیس کے شاگرد تھے اور تھوڑا سا روپیہ ماہوار ایک مدت سے بطور تنخواہ انیس کو دیتے تھے۔ اتفاقاً نواب صاحب نے مجلس کے رقعہ چھپوا کر تقسیم کر دیئے کہ میر انیس مرثیہ پڑھیں گے اور ان سے اجازت نہیں لی۔ مشتاقان انیس رقعہ لے کر انیس کے پاس پہونچے اور بوجہ کمال اشتیاق کے اظہار مسرت کرنے لگے کہ فلاں جگہ آپ پڑھیں گے۔ انیس نے کہا کہ مجکو نہ تو اسکی اطلاع ہے نہ وعدہ ہی مجھ سے کہیں پڑھنے کا لیا گیا ہے آپکو کیوں کر معلوم ہوا۔ کہنے والے نے رقعہ چھپا ہوا دکھا دیا۔ انیس نے کہا "ایک میں ہی انیس تھوڑی ہوں کوئی اور اس نام کا پڑھے گا۔ میں تو نہیں پڑھوں گا ———" جہاں یہ گفتگو ہوئی وہاں بہت سے آدمی تھے سب نے سنا۔ یہ خبر نواب صاحب کو ہوئی۔ دوسرے دن وہ آئے بہت معذرت کی کہ میں نے اس بھروسہ پر آپکا نام رقعہ میں چھپوا دیا کہ میرے کہنے سے آپ ضرور پڑھیں گے۔ اگر آپ نہ پڑھیں گے تو میری سبکی ہوگی

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

انیسؔ :۔ یہ وہی مشاعرہ ہے جو حضرت ولی اللہ کی خانقاہ کے عقب کے میدان میں شب چہار دہم ہونے والا ہے۔

آزاد :۔ جی ہاں! وہی مشاعرہ۔

انیسؔ :۔ کل مجھ سے دادا جان نے فرمایا تھا کہ ایک مشاعرہ بضرورت حضرت ولی کی طرف سے کیا گیا ہے۔ مجھکو حکم دیا تھا کہ تم بھی شریک ہونا اور (دبیر کی طرف اشارہ کر کے) بھائی صاحب کو بھی اطلاع کرنے کا حکم دیا تھا۔

دبیرؔ :۔ (دونوں وکلاء سے) فی الحال میں اسی حکم جناب محترم پر برادر مکرم (انیس کی طرف اشارہ) سے گفتگو کر رہا تھا کہ محافل مشاعرہ میں تو ہم لوگ کبھی شریک عمل نہیں ہوئے البتہ شریک سماعت ہو سکتے ہیں۔ برادر محترم کے جد معظم میرے

(بقیہ صفحہ ۷۷)

میر انیسؔ نے کہا کہ ان لوگوں کی گفتگو کے پیشتر اگر آپ نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہوتا یا فقط مجھکو اطلاع ہی کر دی ہوتی تو میں یہ نہ کہتا کہ "مجھ سے وعدہ نہیں ہے میں نہ پڑھوں گا" اب اگر یہ کہنے کے بعد پڑھوں تو میری سبکی ہوگی۔ نواب صاحب نے کہا کہ میری بات جائیگی تو مجھکو ملال ہوگا اور اشارۃً یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میری سبکی ہوگی تو وہ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی بند ہو جائے گا۔

انیسؔ کو اس بات پر بہت غصہ آیا انھوں نے اپنا پاؤں جس میں بیچے کام کا کارچوبی جوتا پہنے تھے بلند کیا اور کہا "سو روپیہ بند ہو جائیں گے تو میرا کیا بگڑے گا" انیس کی جوتی کا ایک ستارہ گر جائے گا۔ اب تو میں ہرگز نہیں پڑھوں گا اور کبھی آپ کے یہاں نہیں پڑھوں گا۔

انیسؔ کا جوتا ایک اشرفی (مہرہ) کی قیمت کا اس زمانہ کی وضع کے بموجب ہوتا تھا زرد کاشانی مخمل پر بیچے دو دوزی کام کی اور گی۔ ان کا مجعت ساز بھی ان ہی کا ہم نام۔ اس کا بھی نام ببر علی تھا فرق یہ تھا کہ انیسؔ سید ببر علی تھے۔ جوتے والا مرزا ببر علی۔ ۱۲

واسطے مفترض الطاعۃ ہیں۔ حضرت سنی الجوانب کا حکم شرکت ہے۔ المامور معذور ولیکن شرکت ذکر، شرکت سماعت کا تو کچھ تعین نہیں فرمایا گیا۔

آزاد :۔ جناب درست فرماتے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ اس بزم مشاعرہ میں کسی خاص صنفِ کلام کا تعین نہیں ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ ہر صنف شعر واصناف کلام پڑھے جائیں گے۔ ہر صنف سخن کے باکمال اپنے اپنے جواہر فکر کی آبداری سے فضائے عالم کو منور فرمائیں گے۔

شبلی :۔ گل فردستان باغِ معانی ہیں آپ کے گلہائے مضامین در اصل گل سر سبد ہیں!

انیس :۔ ہمارے گلہائے مضامین تو مسجد کے چڑھے ہوئے پھول ہیں جو ترک ہو جانے کی وجہ سے اب دولہن دولھا کے سہرے میں نہیں چڑھ سکتے۔

آزاد :۔ جی ہاں! اسی خیال کے بموجب بعد ختم مشاعرہ نعت رسول منقبت آل رسول کے واسطے از سرنو محفل مرتب کی جائے گی اور آپ حضرات منبر رسول پر نعت و منقبت ارشاد فرمائیں گے جو باعث برکت اور استجابت دعا ہو۔

انیس :۔ بہتر ہے! مداحی آل رسول تو ہمارا فریضہ ہمیشہ سے رہا ہے

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں | پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

دبیر :۔ بہت انسب ہے! انشاء اللہ المستعان بہ معیت برادر محترم اس خیر الاذکار میں بہ سر و چشم حاضر ہوں گا۔

آزاد و شبلی :۔ اب اجازت ہے۔ ابھی اور حضرات کی خدمت میں عرض کرنا ہے۔

انیس و دبیر :۔ اچھا خدا حافظ۔ فی حفظ اللہ القوی۔

(آزاد و شبلی اٹھتے ہیں انیس و دبیر کھڑے ہو کر تعظیم دیتے ہیں)

(دونوں چلے جاتے ہیں)

گفتگو ساتویں

انشا و رنگین ـــــــ شبلی و آزاد

(انیس و دبیر سے گفتگو کر کے آزاد و شبلی جو واپس ہوئے تو کچھ فاصلے پر سعادت یار خاں رنگین کی زور زور سے بھائی انشا! بھیا! بھیا!! کی آواز نے ان کو ادھر متوجہ کیا۔ دیکھا کہ انشا اپنے غفلت میں ہیں اور میاں رنگین ان کو جھنجوڑے ڈال رہے ہیں)

[انشاء اللہ خاں انشاء :- (ہیئت) رنگت کے بہت گورے جسم کے فربہ صورت کے جامہ زیب، خشخاشی سے کچھ زیادہ سفید داڑھی جس کے بال بال بالکل میلے کچیلے کچھ چپکے ہوئے کچھ منتشر۔ مونچھیں میلی ہو کر زرد رنگ کی ہو گئی ہیں اور داڑھی میں چپک گئی ہیں۔ ضعف اور کمزوری کے آثار چہرے کی جھرّیوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایک رنگین میلا سا کرتا پہنے ہیں اور اس پر میلی کچیلی روئی دار مرزئی۔ سر پہ ایک میلا سا پھینٹا بندھا ہوا ہے ٹانگوں میں ایک رنگین گھٹنا (سوسی کا) ایک توبڑا (بڑا سا پرانا چمڑے کا تھیلا) گلے میں ڈالے۔ پاؤں اسی طرح پھیلائے ہیں کہ گھٹنے اس سے اونچے ہیں اور ان ہی گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے عالم سکوت میں بیٹھے

جھوم رہے ہیں۔]

[سعادت یار خاں رنگین ۔ گھوڑوں کے سوداگر۔ بڑے وضع دار آدمی مصنف تذکرہ مجالس رنگین۔ نواب طہماسپ بیگ قلعہ دار شاہی کے بیٹے۔ دہلی کے مستند رئیس زادے۔ مشہور شہ سوار، تیر اندازی میں شہرۂ آفاق قدر اندازی میں باکمال۔ یہ ایک دفعہ میر تقی میر کے پاس شاگرد ہونے گئے۔ میر نے کہا جاؤ تم امیر زادے ہو شاعری تم کو نہیں آسکتی۔ رنگین انشاء اللہ خاں کے "دستار بدل" بھائی ہیں۔ یہ انشاء سے ملنے ہر سال لکھنؤ میں دلی سے آتے تھے۔ لباس وہی دہلی کی پرانی وضع جو میر تقی میر کی ہے۔ ویسا ہی لباس ہے فقط فرق یہ ہے کہ بائیں بازو پر کمان اور اسی طرف کمر کے قریب ترکش جس میں چند تیر۔ داڑھی میر کی طرح خوب گھنی سفید۔ رنگ بھی خوب صاف میدہ اور شہاب چہرے سے ترکمانی نسل سے ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔]

(انشاء کے سامنے رنگین بیٹھے ہیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے انشاء کا بایاں بازو پکڑ کر ان کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔)

داخلہ : شبلی و آزاد

آزاد : رنگین کی آواز سن کر (شبلی سے) چلئے ان سے بھی وعدہ لے لیں۔ دیکھئے خدا کی قدرت! یہ وہ شخص تھا جس کو "اردو کا امیر خسرو" کہنا چاہیئے اتنا ذکی، ذہین، خوش طبع، جامع کمالات و علوم خاک ہند نے پیدا ہی نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی صدیوں کے بعد مادر گیتی ایسے فرزند پیدا

کرتی ہے۔ ہائے اب یہ حالت ہے! ان سے کیا وعدہ لیں ان کے رفیق سے کہہ دیں۔

شبلی:۔ ان کا فضل و کمال۔ ان کی خدمتِ زبان تو اس کی مستحق ہے کہ ان کو ایوان ادب میں بلند ترین زینہ پر بٹھایا جائے مگر وارفتگی مزاج سے کس کا بس چلتا ہے۔ یہ دوسرے صاحب ان کے رفیق کون ہیں؟ ان سے کہہ دیجئے یہ اگر اپنے ہمراہ ان کو لے آئیں تو کیا کہنا ہے۔

آزاد:۔ (رنگین کی طرف اشارہ کر کے) ان کو آپ نہیں جانتے؟ یہ ان کے دستار بدل بھائی ہیں، میاں سعادت یار خاں رنگین، صاحب مجالس رنگیں یہی ہیں یہ بھی اپنے فنِ ریختہ گوئی میں مثل نہیں رکھتے حقیقت میں ریختی کے موجدوں میں ہیں۔

(آزاد و شبلی دونوں ان کی طرف بڑھتے ہیں)

آزاد:۔ (رنگین سے) سلام علیکم

رنگین:۔ وعلیکم السلام۔ مزاج مبارک؟

آزاد:۔ الحمد للہ۔ کہئے حضرت (انشاء کی طرف اشارہ) کا مزاج کیسا ہے؟

رنگین:۔ کیسا مزاج بتاؤں؟ وہی ایک عالم وارفتگی ہے۔ ؎

"دیوانہ باشی تا غم تو دیگراں خورند"

آزاد:۔ کیا صاحبِ کمال۔ جامع علوم و فنون شخص ہے ہائے! مگر یہ حالت ہے کہ دیکھنے سے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جاتی ہے فاعتبرو یا اولی الابصار

شبلی:۔ ہائے یہی انشاء ہیں! کہ ان کو نہ اپنی خبر ہے نہ دوسرے کی!

آزاد :- اپنا تو مبتدا و خبر دونوں فراموش کئے ہیں نوبت یہ ہے کہ دوسرے ان کی خبر لیں تو کچھ ان کو خبر ہو۔

رنگین :- (آزاد سے) آپ کیا خبر لائے جو ادھر بھول پڑے؟

آزاد :- جناب عالی! حضرت ولی اللہ نے اب کی چاند کی تیرھویں گزر کر رات کو بعد مغرب ایک مشاعرہ اپنی خانقاہ کے پیچھے کے میدان میں منعقد کیا ہے جس میں ہر صنف شعر پر ہر استاد اپنے طرز خاص میں پڑھے گا ہم لوگوں کو جناب موصوف نے ایک فہرست اساتذائے باکمال کی مرحمت فرمائی ہے کہ ہم لوگ انکی طرف سے سب کو مطلع کریں۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ بھی ریختی اپنے طرز خاص میں پڑھئے گا۔ اور حضرت (انشاءؔ) کو اپنے ساتھ لیتے آیئے گا۔

رنگین :- جب ہوش میں آئیں تو حضرت ولی کا پیغام پہونچا دیجئے گا اور اپنے ہمراہ ضرور لائیے گا۔

(رنگین و آزاد دونوں واپس ہوتے ہوئے) خدا حافظ۔

گفتگو آٹھویں

حضرت واجد علی شاہ اختر سے ملاقات

کوندے کی یاد باریک اور گلگونہ شفق کی رنگین عکاسی فضا کو ایک عجیب لطیف ضیا باری سے پر نور کئے ہے برق کا چشمک گو کہ کا داک خطوط میں افق

کو منور کر دیتی ہے مگر ان بے ڈھنگی لکیروں میں کچھ ایسا قدرتی بناؤ اور کشش ہے کہ آزاد ایسے آزاد طبع اور شبلی ایسے صوفی باصفا کی تارک الدنیا نظریں اسی طرف اُٹھی جاتی ہیں۔ اس دل کش اور دیدہ زیب منظر کی طرف جو ان کی نگاہیں اُٹھیں تو ایک پھولوں کی کشت زار کے پیچھے ایک وجیہہ و پُر نور چہرہ چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر کچھ ایسا خدا داد رعب ہے کہ دونوں نظر بازوں کی آنکھیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ آزاد تو متحیر تھے کہ کس کوکب اقبال کی چمک ہے جس کی طرف دل بخود کھنچا جاتا ہے مگر رعب و دبدبہ نگاہ کو اُٹھنے نہیں دیتا ہاں شبلی نے انتہائے جوش و خروش میں مہر سکوت توڑی۔

شبلی :- (آپ ہی آپ) ارے یہ تو سلطان عالم حضرت اختر ہیں! (آزاد سے) چلئے چلئے کم از کم آداب عرض کر لیں۔ اگر موقع ہوا اور اصل تو یہ ہے کہ اگر رعب شاہی نے زبان کی یاوری کی تو عرض حال بھی کر لیں گے۔

آزاد :- اچھا! واجد علی شاہ بہادر اختر یہی ہیں؟

[سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ بہادر اختر :- بہت سرخ و سفید بالکل میدہ و شہاب رنگ۔ بہت موٹے فربہ۔ چہرے پر رعب و جلال شاہانہ بڑی بڑی آنکھیں مست پر رعب نگاہ جس میں سرمہ کی کشش نے دلکشی پیدا کر دی ہے۔ کشادہ پیشانی بہت خمدار ابرو، رخسار بہت پھولے ہوئے۔ ٹھوڑی کے پاس جا کر ایک نہایت دل کش گہرائی جس سے چاہ ذقن بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے، مونچھیں بہت گھنی اور بہت بڑی بڑی۔ بال اور مونچھیں خضاب سے بالکل سیاہ اور بڑی بڑی

مونچھیں۔ سر پر کاکلیں جن میں بہت زیادہ پیچ و خم اور گھونگر بھی۔ یہی آگے کی طرف آ کر زلفیں بن گئی ہیں۔ کچھ کچھ بال ماتھے پر نہایت دل کش خمدار محراب کی صورت میں مڑے ہوئے ہیں۔ اس عہد کے مردانہ حسن کا ایک دلفریب مجسمہ۔ لباس ؛۔ سر پر سرخ بڑے روئیں کے مخمل کی کارچوبی ٹوپی دو پلی جس پر جواہرات کا ایک چھوٹا سا جیغہ۔ زیب جسم بہت عمدہ جامدانی کا ایک انگرکھا بغیر کرتے کا۔ انگرکھے کے پردے کے نیچے سے خوب گورا گورا جسم دکھائی دے رہا ہے۔ انگرکھے کے دامن بہت گھیر دار ہیں۔ ٹانگوں میں سبز گرنٹ کا چوڑی دار پائجامہ جس کی مہریوں کے کنارے پر کارچوبی بیل ٹکی ہے ہلکے کارچوبی کام کی مخملی زرد کاشانی مخمل کی گرگابی۔]

(نصف قد سے پھولوں میں چھپے ہوئے ہیں اس واسطے دور سے پائجامہ اور جوتا نظر نہیں آتا۔ رعب سلطانی آزاد و شبلی کی نگاہیں اونچی ہونے نہیں دیتا۔ لیکن وطن کے بادشاہ کی محبت کی کشش قدم کھینچے لئے جاتی ہے۔)

(پھولوں کی روش کے قریب پہنچ کر دونوں آدمی جھک کر سلام کرتے ہیں) آواز نہیں سنائی دیتی جسم خم ہوتا ہے اور داہنا ہاتھ تقریباً تین بار گھٹنے سے ماتھے کی طرف جاتا ہے اور ہاتھ کی ہر حرکت پر ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔

(یہ لکھنؤ کا درباری سلام ہے)

جب سلام کر کے سیدھے کھڑے ہوئے تو بادشاہ نے ذرا مسکرا کر اپنی گردن کو خم کر کے اور ہاتھ کو تھوڑا بلند کر کے جوابِ سلام دیا اور آنکھوں کے اشارے

سے کہا کہ پشت پر سے یعنی روش کی دوسری طرف سے قریب چلے آؤ۔

شبلی:۔ بسر و چشم (ذرا پھیر کھا کر دونوں آدمی بادشاہ کے داہنے ہاتھ کی طرف پہنچ گئے۔ نگاہیں نیچی کئے ادب سے خاموش کھڑے ہیں)

بادشاہ:۔ بھئی میرے قریب آؤ۔

(دونوں آدمی چند قدم بڑھتے ہیں پھر کھڑے ہو جاتے ہیں)

(شبلی سے) تم تو اختر نگر[1] کے معلوم ہوتے ہو؟

شبلی:۔ (دست بستہ) جی جہاں پناہ خانہ زاد عرصۂ دراز تک لکھنؤ میں رہا ہے۔

بادشاہ:۔ ہاں! وہ تو بھئی تمہاری طرف ہمارا کچھ دل کھنچتا ہے۔ دیکھو یہ جبل پریوں کی تصویر سنگی کیسی اچھی بنی ہے ہو بہو ویسی ہی تصویر ہے جیسی اختر نگر میں ہم نے اپنے قیصر باغ کے چاروں پھاٹکوں پر بنوائی تھی۔ کیوں بھئی اب بھی چاروں پھاٹکوں پر بنی ہے؟

شبلی:۔ (بہت رنجیدہ لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر) جہاں پناہ اب چاروں پھاٹک ہی کہاں رہے سب کھد اگئے دو پھاٹک باقی ہیں، ایک چوکھی کی طرف دوسرا روشن الدولہ کے سامنے۔

بادشاہ:۔ (ٹھنڈی عمیق سانس بھر کر) ہاں بھئی! جب مکین ہی نہ رہے تو مکان کا کیا رہا رہا نہ رہا مگر پھر بھی۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید است صنا دید عجم را

(آزاد کی طرف مخاطب ہو کر) تمہارا تعلق دربار شہنشاہی سے معلوم ہوتا ہے

[1] واجد علیشاہ مرحوم لکھنؤ کو ایام جلا وطنی میں "اختر نگر" کہتے تھے اختر انکا تخلص تھا اسی سے منسوب۔

یہ دہلی کی وضع ہے شاید آزاد تم ہی ہو؟ بھائی صاحب نے تمہارا کئی بار ذکر کیا تم نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔

آزاد:۔ (دست بستہ) جی جہاں پناہ خانہ زاد کا نام تو آزاد ہے لیکن اپنے ملک کی زبان و تہذیب اور اپنے وطن کے بادشاہ کی محبت کا اسیر ہے۔

شبلی:۔ جہاں پناہ! اس وقت بھی ہم لوگ خدمت زبان ہی کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

بادشاہ:۔ اس عالم ارواح میں اور کہ عالم آب و گل تک کیا خدمت کا اثر پہونچا سکتے ہو؟

شبلی:۔ بادشاہان ملک معانی و تاجداران مملکتِ زبان دانی کے احکام کی تعمیل میں سرگرم رہنا بھی ایک خدمت ہے۔

آزاد:۔ جہاں پناہ! ہم لوگ حضرت ولی اللہ کے حکم سے ایک مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں اسی کی شرکت کا وعدہ لینے کے واسطے نکلے ہیں خود حضرت ولی اللہ نے بوجہ پیرانہ سالی اور خانہ نشینی کے ہم لوگوں کو مامور کیا ہے کہ ہم انکی طرف سے بندگان عالی کی خدمت میں عرض کریں کہ جس طرح جہاں پناہ کا دربار عالم آب و گل میں شعراء و کاملین زبان اردو کو پناہ دیتا تھا اسی طرح عالم ارواح میں شعرائے اردو کی سرپرستی کرے اور مستدعی ہیں کہ

سہ بادشاہوں سے غیر درباری باشانہ بات چیت نہیں کر سکتے بادشاہ یہ جانتے ہیں اسی واسطے وہ ایسے سوالات کر لیتے ہیں جن کے جوابات سے ان سے عرض کرنے والے کا مافی الضمیر معلوم ہو جائے۔

جہاں پناہ کا کلام فیض نظام جو حقیقتہً (بادشاہ کلام) ہے اپنے فیوضات سے مستفیض کرے۔

بادشاہ:۔ بھئی میں تو شعر و شاعری کا عاشق ہوں بہت مبارک بِنا ہے اور کھیے ولی اللہ کی ڈالی ہوئی بِنا..... اچھا یہ بتاؤ کہ ہمارے شہنشاہ بہادر کو بھی اس کی خبر ہے؟

شبلی:۔ جی جہاں پناہ:۔ حضرت شہنشاہ بہادر تشریف لائیں گے۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے۔

بادشاہ:۔ اچھا تو ہم بھی اُن کے ساتھ آئیں گے۔ تاریخ و وقت و مقام تو اُن کو معلوم ہے نا؟

آزاد:۔ جی جہاں پناہ۔ حضرت ظل اللہ کو معلوم ہے تیرہویں ذی الحجہ گذر کر ۸ بجے شام کو بعد غروب حضرت ولی اللہ کی خانقاہ کے عقب کے میدان میں یہ محفل برپا ہوگی۔

بادشاہ:۔ اچھا بھئی ہم آئیں گے.......... خدا حافظ۔

(پردہ گر جاتا ہے)

سین پانچواں

آمد اور ترتیب

ایک کشادہ سبزہ زار ہے چاروں طرف خوش نما پھولوں کے درخت ہیں حضرت ولی کی خانقاہ کی پشت پر یہ سبزہ زار تقریباً مربع شکل میں ہے۔ جس طرف ایک دل کش آبشار دکھائی دیتا ہے اسی طرف کی زمین ذرا بلند ہے باقی سب ہموار۔ گویا اس میدان کی سطح ڈھالو سی ہے۔ جس کا ڈھال آبشار کی طرف سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرف بلند حصہ پر ایک بڑی سی مسند بچھی ہے۔ اور مسند کے سامنے بہت صاف ستھرا اور وسیع فرش بچھا ہوا ہے۔ مسند پر بڑے بڑے تین گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں۔ باقی فرش پر رنگ برنگی غلافوں کے تکیے قوس کی صورت میں رکھے ہیں۔ اس طرح کہ نیم دائرہ (SEMI CIRCLE) بن گیا ہے، اس نیم دائرے کے قطر پر بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لئے کوئی گاؤ تکیہ بھی نہیں رکھا گیا ہے صرف محیط پر لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ فرش میں انتہائی سادگی اور بے حد صفائی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مسند یں جہاں بچھی ہیں اس طرف فضا میں قوس قزح کا رنگ (غالباً آبشار کے عکس سے) پڑ رہا ہے۔ یہی پرلطف رنگ مسند نشینوں کے واسطے شامیانے کا کام دے رہا ہے۔

ولی اللہ کے تینوں وکیل (آزاد، شبلی، فرحت اللہ) فرش پر ٹہل رہے ہیں اور ہر ہر گوشۂ فرش و سبزہ زار کو دیکھ رہے ہیں کہ کہیں کوئی سقم تو نہیں ہے۔ دنیا کے مشاعروں کی محفل کی طرح یہاں نہ حقے ہیں نہ پانوں کے خاصدان

صرف گاؤ تکیوں سے محدود جو خالی حصہ ہے اس کے وسط میں پانچ، سات بڑے بڑے گلدان رکھے ہیں جن میں بہت خوش نما پھولوں کے گچھے کے گچھے لگا دئے گئے ہیں۔

(آزاد و شبلی مسندوں کی طرف ٹہل رہے ہیں اور فرحت اللہ بیگ فرش کے کنارے کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر یہ دیکھ رہے ہیں کہ گلدستوں کے پھولوں سے شاعروں کے چہرے تو کہیں سے نہیں چھپتے)

آزاد:۔ (شبلی سے) تمام شعراء کو کس ترتیب سے بٹھانا مناسب ہوگا؟

شبلی:۔ مولانا یہ کام تو حضرت آپ ہی کو کرنا چاہیئے۔ وعدہ لینا ہمارا کام تھا۔ اب وکالت ختم ہو گئی۔

آزاد:۔ ان کی پیرانہ سالی اس امر کی متقاضی نہیں ہے کہ وہ کسی کا استقبال کریں اور سب کو بٹھائیں یہ کام بھی لامحالہ ہم ہی لوگوں کے حوالے ہوگا تو ابھی سے کچھ نہ کچھ کیوں نہ سوچ رکھا جائے (فرحت اللہ بیگ سے مخاطب ہو کر) ذرا ادھر آئیے مرزا صاحب۔

فرحت:۔ ابھی حاضر ہوا۔ ذرا اس گلدان کو بیچ میں کھسکا دوں تو ایک توازن پیدا ہو جائے۔ (ایک گلدان کو مسندوں کے بالکل وسط میں سامنے کی طرف ذرا کھسکا کر آزاد کی طرف آتے ہیں) جی! ارشاد!!

شبلی:۔ مرزا صاحب ابھی یہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ شعراء کو کس ترتیب سے بٹھایا جائے۔

فرحت:۔ ہاں خوب یاد آیا، حضرت ولی اللہ نے جب کل میں ان سے یہ کہنے

گیا تھا کہ وعدے ہوگئے سب شعراء نے آنے کا اقرار کیا ہے تو مجھ سے فرمایا تھا کہ بھئی ٹھہانے کا انتظام بھی تم ہی کو کرنا ہے جس طرح مناسب ہو بٹھالینا میری رائے تو یہ ہے کہ ایک طرف دہلی والوں کو بٹھایئے اور دوسری طرف اہل لکھنؤ کو۔

آزاد:۔ اور جو شاعر نہ لکھنؤ کا ہو اور نہ دہلی کا اس کو کہاں بٹھائیں۔

فرحت:۔ ایسے لوگوں نے یا تو طرز دہلی اختیار کیا ہے یا طرز لکھنؤ اسی طرز و انداز کے لحاظ سے اسکو بٹھایئے۔

آزاد:۔ اس طریقۂ نشست سے آپس میں موازنہ و مقابلہ کا جذبہ یہاں بھی پیدا ہوگا اور اصل مقصد مشاعرہ ثانوی ہو جائے گا۔ آپس کے مقابلہ سے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ایک متحدہ محاذ درستی زبان و اصلاح کا ہونا چاہیئے۔

شبلی:۔ دوسرے یہ کہ وہ شعراء جو پیدا ہوئے دہلی میں اور مرے لکھنؤ میں۔ یعنی یہاں (عالم ارواح میں) لکھنؤ سے آئے۔ ان کو جہاں بٹھایئے گا دوسرے شہر والے اپنا شہری استحقاق ان پر ثابت کریں گے۔

آزاد:۔ میری رائے میں تو ان کے یہاں آنے کی تاریخ کے لحاظ سے ان کو بٹھانا چاہیئے یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے لوگ ایک طرف اور چودھویں صدی والے دوسری طرف۔ جو بارھویں صدی ہجری یعنی سترھویں صدی عیسوی والے تین چار شعراء ہیں انکو اٹھارویں صدی عیسوی والوں میں ملا دیجئے اور انیسویں صدی والوں کو ایک مقابل سمت میں اس طرح بٹھایئے کہ یہاں جو پہلے آیا ہے وہ پہلے

پڑھے اور بعد کو آنے والا اس کے بعد۔ سب سے پہلے آنے والا صدر کے قریب اس کے بعد دوسرا پھر اسی سلسلہ میں ۱۲۹۹ھ والا سب کے آخر میں دوسری طرف ۱۲۰۰ھ والا سب سے پہلے اور ۱۳۰۷ھ۔ یعنی ۱۹۵۱ کا سب کے آخر میں، اس صورت نشست میں نہ تو مقابلہ شعری ہوگا اور نہ خیال تفوق و برتری بلکہ ہر صدی میں جو جو اصلاحیں اور ترقیاں زبان میں ہوئی ہیں وہ سال بہ سال نمایاں ہوتی جائیں گی

شبلی:۔ بہت مناسب ہے میں اس طریقہ کو بہت پسند کرتا ہوں اور پڑھنے میں یہ ہو کہ ایک ہی کنول ہو جو پہلے بارہویں صدی سے شروع ہو کر گردش کرتا ہوا تیرہویں صدی کے ختم تک پہونچے پھر چودھویں صدی کے شاعر کے سامنے سے چل کر آخریں پڑھنے والے تک پہونچ جائے۔

فرحت:۔ یہ صورت تو بہت اچھی ہے اور اس میں کیا ہرج ہوگا کہ جب تقریباً نصف شعراء پڑھ چکیں تو اتنا وقفہ دیدیا جائے کہ اہل دنیا نماز عشاء سے فراغت حاصل کر لیں اور بعد نماز عشاء پھر سے مشاعرہ جمے یعنی چودھویں صدی کے شعرا شروع کریں۔

آزاد:۔ بہت مناسب ہے ذرا تفرہ بھی ہو جائے گا اور نماز سے فراغت بھی۔

شبلی:۔ اچھا میری رائے یہ ہے کہ حضرات مداحین رسولؐ و آل رسولؐ بعد ورود مشاعرہ اپنا اپنا کلام سنائیں اس طرح کہ منبر پر بیٹھ کر بالکل مجلس کی صورت ہے، ان کے کلام کی اصل شان اسی طرح ظاہر ہوگی۔

آزاد:۔ یہی صورت تو ان حضرات سے وعدہ لیتے وقت طے بھی ہوئی تھی۔

فرحت:۔ بہت مناسب ہے۔ یہ اچھی صورت ہوگی۔

(یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ کچھ لوگ آتے ہوئے دکھائی دیے) مڑ کر جو دیکھتے ہیں تو دیکھا سودا، درد، حسن تینوں آدمی آرہے ہیں۔

(۱) آگے آگے سودا:۔

[مرزا محمد رفیع سودا۔ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۱ء میں پیدا ہوئے پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۴ء میں بعمر ۷۰ سال دنیا سے گئے۔ عالم ارواح کے مشاعرے میں اس صورت سے آئے کہ:۔ کھڑکی دار پگڑی بہت بڑے گھیر کا نیمہ جامہ، ایک پورا تھان کمر سے لپٹا ہوا ایک سوا گز کا چارخانے کا رومال اس میں آویزاں، ایک اتنا ہی بڑا رومال بائیں کندھے پر پڑا ہوا۔ مشروع کا (جوزی) ایک ایک کلی کے پائنچے کا پاجامہ اوپر سے ایک کاک ریزی رنگ کا فرغل اوڑھے ہوئے ہیں۔ گول سفید داڑھی۔ سفید متوسط مونچھیں داڑھی سے پیوست۔ ایک تسبیح بائیں طرف کمر میں لٹک رہی ہے، کافی تنومند آدمی خوب گورے گورے، آستینیں جامے کی بہت چھوٹی چھوٹی ہیں اور کلائی سے کہنی تک خوب چنی ہوئی ہیں۔

پہلے شاعری کی تکمیل فارسی میں کی اور شاہ عالم کی فارسی غزلوں پر اصلاح دیتے رہے پھر شجاع الدولہ کے دربار میں اودھ پہونچکر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا آغا باقر کے امامباڑے میں قبر ہے۔ اردو کی شاعری پر پوری اور کامل دستگاہ ہے ہر صنف

میں قدرت رکھتے تھے۔ "غزل میں کلام کا زور مضمون کی نزاکت ایسا دست وگریبان جیسے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔" (آزاد) ڈاکٹر محمد چاند) "بندش نہایت چست معنویت اور درد بھی کچھ کم نہیں۔" (اعجاز حسین) "کبھی کبھی ہندوستانی چیزوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستانی بلکہ ہندی الفاظ تلازم اور عام رسوم کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے" (محمد چاند)]

ان کے دوش بدوش خواجہ میر درد اور ان کے پیچھے پیچھے میر غلام حسن حسن تشریف لا رہے ہیں۔ ان کو آتا دیکھ کر آزاد اور شبلی استقبال کو بڑھے فرحت اللہ سلام کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ آزاد نے آگے بڑھ کر سلام علیک کر کے مصافحہ کیا اور اپنے ساتھ لے جا کر مسند کے داہنے بازو پر سب سے پہلے سودا کو بٹھایا، انکے داہنے ہاتھ پر میاں درد اور ان کے داہنی طرف حسن بہت مؤدبانہ طرز سے درد کے اشارے پر بیٹھ گئے۔

[سید خواجہ میر درد تخلص۔ شاعری اور تصوف ان کو میراث میں ملا ہے ۱۱۳۳ھ/۱۷۱۹ء میں پیدا ہوئے (۶۶ سال کی عمر کر کے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں دنیا سے عالم باقی کی طرف کوچ کیا ان کی غزلیں ۷ سے ۹ شعر تک کی ہوتی ہیں مگر "بالکل انتخاب" (تاریخ ادب اردو) چھوٹی بحروں میں خوب کہتے ہیں "گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے ہیں۔" (آزاد، آبحیات) "خیالات سنجیدہ اور متین" (مختصر تاریخ ادب)

سرخ وسفید رنگ شرعی وضع بخارہ کے لباس سے ملتا جلتا کچھ لبادہ اس کے نیچے چکن سبز پٹکے سے کمر بندھی ہوئی بخاری سیدوں

کی علامت) گلے میں تسبیح]

[میر غلام حسن حسنؔ:۔ ابن غلام حسین میر ضاحکؔ پہلے باپ سے اصلاح لی۔

پھر دردؔ سے۔" ان کی حیات جاودانی کا راز غزل ہے نہ قصیدہ بلکہ مثنوی جو اس آب و تاب سے دربار اردو میں پیش کی گئی کہ اگلے پچھلے شعراء کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔" (اعجاز حسین - سیر المصنفین وغیرہ)

سنہ ۱۱۴۰ھ - ۱۷۲۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ۶۱ سال کے بعد سنہ ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں (فیض آباد) میں انتقال کیا، ان کی دس یا گیارہ مثنویاں، مگر "سحرالبیان" اردو کی وہ بے نظیر مثنوی ہے جس کا جواب اردو کی شاعری کے پاس ابتک نہیں ہے، ان کے پوتے میر انیس نے مرثیے کے میدان میں وہی کار ہائے نمایاں کئے جو دادا نے مثنوی میں کئے تھے۔" (آزاد، اعجاز حسین، تنہا) نہایت خندہ پیشانی، شگفتہ مزاج ظریف الطبع تھے۔ اپنے زمانہ کے جملہ توازمِ تہذیب و شائستگی و شرافت کی پابندی کرتے تھے مگر آئین خاندان کی پاسداری بھی گویا ایک فریضہ تھی جس کے لحاظ سے ڈاڑھی منڈواتے تھے لباس میں بھی وہی انداز کہ ایک بہت لمبا کرتا (دامن لمبے لمبے) جس کے گریبان میں آگے کی طرف کھلا ہوا چاک نہیں ہوتا بلکہ دونوں شانوں پر گھنڈی تکمہ (عاشق و معشوق) مشروع کا پائجامہ[1]۔ سر پر پچگوشیہ ٹوپی قالب چڑھی

---

[1] سنہ ۱۲۹۹ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء تک لکھنؤ اور دہلی میں مشروع کا رنگین پائجامہ رائج تھا اس کے بعد تقریباً سنہ ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء سے لکھنؤ میں سفید بڑی مہری یا چوڑی دار پائجامہ بھی شروع ہوا۔ دس برس بعد صرف سفید پائجامہ رہ گیا ۱۲۔

مونچھیں ذرا گھنی (ناک پر موٹی) اور لمبائی میں بہت بڑی اوپر کو ذرا چڑھی ہوئی۔]

ابھی شبلی اور آزاد ان لوگوں سے بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ میاں انشاء اللہ خاں آتشؔ کو لئے ہوئے سعادت یار خاں رنگین اور جرأت ہاتھ پکڑے ہوئے میاں مصحفی کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ جرأت کا ایک ہاتھ مصحفی کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی ہے جس سے ٹٹول ٹٹول کر میاں جرأت چل رہے ہیں[1]۔

انشاء اللہ خاں نے اپنا توبڑا گلے سے اتار کر اپنے پہلو میں رکھ لیا اور اسی عالم میں بیٹھ گئے جیسے اس کے پہلے ہین سیر گاہ عالم ارواح میں وعدہ لیتے وقت دیکھا تھا کہ بیٹھے ہیں۔ ان کو لا کر بٹھایا۔ ابھی یہ لوگ تعارف کر کے دوش بدوش بیٹھے ہیں کہ حضرت ناسخ و آتش و نسیم میاں نظیر اکبر آبادی کو جھرمٹ میں لئے ہوئے اس طرح آئے کہ نظیر اور ناسخ ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ نظیر گورے رنگ کے دبلے پتلے آدمی ہیں اور ان کے برخلاف ناسخ بہت

---

[1] جرأت کے اندھے ہونے کی ایک روایت تو یہ ہے کہ چیچک جو عین جوانی میں نکلی تو آنکھوں کی بصارت اپنے ساتھ لے گئی۔ دوسری روایت مولانا آزاد اپنے استاد ذوق کی زبانی ان کی نابینائی کا ایک سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصل میں اندھے نہ تھے بعض وجوہ سے کہ شوخی طبع کا مقتضا ہے خود اندھے بنے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی سفارش سے امیروں کے زنان خانے میں گذر ہوا۔ آنکھ اوڑ پہاڑ اوٹ کے پردے میں دنیا دی پرستانوں کی سیر کی۔ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں سینکیں۔ گرمی حسن کے نظارے سے نور بصر کا فور ہوگیا۔ آخر کار سفید چشم ہو کر رہ گئے۔ (آب حیات صفحہ (۲۳۸) وصفحہ (۲۳۹)

موٹے تو انا جسم شمیم سیاہ فام آدمی ہیں۔ صبح روشن کے پہلو میں شب دیجور کا جلوہ پیش نظر ہے۔

ان سے ذرا پیچھے آتش اپنے چہیتے شاگرد نسیم کے ہمراہ بہت خراماں رفتار سے چلے آرہے ہیں۔ آج آتش اپنی پرانی سپاہیانہ انداز۔ آزادانہ وضع کے ساتھ ساتھ جو اس عہد میں رائج تھی (چپکن) پیچ گوشیہ قالب دار ٹوپی، اوسط کی داڑھی، کاکلیں بٹی ہوئی گلوں پر گل مچھے، چھریرا بدن کشیدہ قامت) وہ ہمیشہ تلوار باندھتے تھے آج ایک قرابین بھی ساتھ لئے ہیں (قرابین (CARABINE) یورپ کی ساختہ ایک چھوٹی بندوق ریوالور کی ایجاد کے پہلے اسی کا استعمال ہوتا تھا۔) یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آغا میر کی ڈیوڑھی پر لکھنؤ میں (جس عمارت میں آجکل گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج ہے) خواجہ وزیر نے مشاعرہ کیا تھا جس میں یہ طے کیا تھا کہ ناسخ کو خلعت دے کر آتش پر امتیاز حاصل کرایا جائے۔ اس وقت آتش بالکل آتش کا پرکالہ بنے تیار اور مسلح ہو کر آئے تھے کہ اپنی عزت بچائیں (دیکھو آب حیات صفحہ ۳۱۴) اور لطف تو یہ ہے کہ قرابین بھرا ہوا ہے ذرا تیور بھی ٹھیک نہیں ہیں مگر ولی ایسے بزرگ شاعر کی دعوت پر آنا ضرور ہے اس لئے چلے تو آئے ہیں مگر ناسخ سے ذرا الگ الگ ہیں۔

ان سب لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لے کر شبلی اور آزاد نے لا کر بٹھایا۔

آزاد اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ بعض لوگ اپنے صحیح نمبر پر نہیں بیٹھے ہیں مگر یہ لوگ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ (آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں

کہ کیا کرنا چاہیئے، آخر یہ طے ہوا کہ جب ولی آئیں گے تو آخر سب ان کی تعظیم کو کھڑے ہو کر ان کا استقبال کریں گے اس وقت ممکن ہے کہ کوئی صورت ایسی بن پڑے کہ یہ شعراء اپنی اپنی وفات کے سلسلہ وار نمبر پہ بٹھا دئے جائیں۔

اب کیا دیکھتے ہیں کہ مومن، غالب، ثاقب، اقبال، عزیز سب کے سب غالب کو حلقہ میں لئے ہوئے چلے آرہے ہیں، مومن و غالب کو پہچان کر آزاد و شبلی بڑھے۔ ثاقب و اقبال و عزیز سے فرحت اللہ زیادہ واقف تھے یہ ان کی طرف چلے، ثاقب، اقبال و عزیز کو تو فرحت اللہ نے لیجا کر دوسری طرف یعنی صدر کے بائیں ہاتھ کی طرف کے نصف قوس میں بٹھادیا اور ان کے آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، ادھر غالب کو آزاد نے آتش کے قریب بٹھادیا۔

اب آٹھ بجنے کے قریب وقت ہو رہا ہے کہ برابر ایک تانتا سا لگ گیا لوگوں کے آنے کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوتا۔ ذوق کے ساتھ داغ اور انکے ہم عصر میاں امیر مینائی آئے ذوق کو مومن کے پاس بٹھایا گیا داغ اپنے ہم عصر امیر کو لے کر ذوق کے مقابل والی قطار میں ان کے سامنے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے امیر مینائی و داغ سے شبلی کا تعارف کرا رہے ہیں کہ اتنی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے حضرت ولی شمس اللہ اور ان کے ساتھ ساتھ میر تقی میر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی سب لوگ ایک دم سے تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب مسن لوگ، مثلاً سودا، درد، حسن، مصحفی، ناسخ انکی طرف مصافحہ کرنے کو بڑھتے ہیں۔ ولی سب کا سلام لے کر اور بعض لوگوں سے مصافحہ کر کے

سب سے کہتے ہیں۔

ولیؔ:۔ (وکلا سے) تم صاحبان کون وکیل ٹہراکر ہمن کو اطمینان ہوا تم سبھن نے بھوت عمدہ انصرام کیا اچھے ہمن کوں آپن وظیفہ مینے حبس کا ہمن کوں عادت سی عالم اجسام سوں پڑی ہوئے اچھے بھوت دیر بیت گئی (اہل مشاعرہ سے مخاطب ہوکر) تم سب مردان ہمن کوں معاف کرنا ہو درست یوں اچھے کہ یوہ ہر سہ وکیلان حقیقت منے میزبانی کا منصب دار ٹہرے سو یوہ اس جائے نِج نت موجود رہے۔

ابھی ولی نیچ مجمع ہیں کھڑے ہی ہوئے ہیں کہ مصحفیؔ اور ناسخؔ سب کی طرف سے جواب دیتے ہیں:۔

مصحفیؔ و ناسخؔ:۔ "جناب درست فرماتے ہیں۔ ہم لوگ حسب الحکم حاضر ہو گئے اور یہ تینوں آپ کے وکلاء ہم سب کی میزبانی میں ہمہ تن منہمک ہیں جناب نے بہت اچھا کیا کہ اپنے مقررہ اوراد و وظائف سے حسب عادت فراغت حاصل کر کے تشریف لائے"۔

سب لوگ لے جا کر ولیؔ کو صدر میں مسند پر بٹھاتے ہیں۔ جب یہ بیٹھ جاتے ہیں تو جو لوگ کھڑے تھے اور اپنی جگہ سے کچھ کچھ ہٹے ہوئے تھے بیٹھ جاتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کو حسرتؔ اپنے ساتھ لے جا کر بٹھا لیتے ہیں۔ رنگینؔ کو ناسخؔ اپنے پاس کھینچ لیتے ہیں۔ انشاؔ کو آزادؔ۔ نظیرؔ و ناسخؔ کے درمیان بٹھا دیتے ہیں۔ جراتؔ کو جو ابتک مصحفیؔ کے بعد بیٹھے تھے۔ آزادؔ یہ کہہ کر اٹھا لاتے ہیں کہ "چلئے آپ کو میر صاحب اپنے قریب بلا رہے ہیں"۔

اتنی دیر میں دبیر، انیس، نقش اور ان سے کچھ پیچھے محسن آتے ہیں۔ ان کے داخلہ پر انیس کو غالب اپنے پاس بلا کر بٹھا لیتے ہیں۔ آزاد انیس اور دبیر دونوں کو وہاں تک پہونچا دیتے ہیں۔ ادھر شبلی محسن کو امیر مینائی کے پہلو میں بٹھا دیتے ہیں۔ میاں نقش باتیں کرتے ہوئے دبیر کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں اور وہاں ان ہی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔

ابھی یہ لوگ بیٹھے ہی ہیں کہ شوق آکر "سلام علیکم" کہتے ہیں اور آتش کو بہت ادب سے سلام کرتے ہیں۔ (آتش کے شاگرد ہیں) ان کو ذوق نے آواز دی۔ "آیئے آیئے شوق صاحب شوق سے آیئے ہم آپ ہم قافیہ ہیں۔ ہمارے ردیف بنجائیے۔" شوق ادھر بڑھتے ہیں اور ان کے بعد بیٹھ جاتے ہیں۔

اب جلال اور برق دکھائی دیے۔ داغ نے جلال کو اپنے قریب بلا لیا۔ (دربار رام پور میں دونوں باکمال عرصہ تک ساتھ رہ چکے ہیں) شبلی نے برق سے کہا "چلئے جج صاحب حضرت داغ ہی کے قریب بیٹھئے۔" جج صاحب یہ کہتے ہوئے بڑھے "حاضر ہوتا ہوں حضرت (داغ) نے ہمیشہ زبان وطرز شاعری میں لکھنؤ والوں کا ساتھ دیا ہے۔ ہم لوگ بھلا ان کو کہیں اکیلا چھوڑ سکتے۔" فرحت اللہ بیگ ان لوگوں کو بٹھا کر پلٹے ہی تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے مدعو کئے ہوئے دیگر مہمان آرہے ہیں جلدی سے ان کے استقبال کو بڑھے اب کیا دیکھتے ہیں کہ ظریف آگے آگے اور ان سے کچھ پیچھے میاں حالی پانی پتی چلے آرہے ہیں ظریف کو دیکھ کر عزیز نے کہا۔ "مرزا صاحب ان دونوں آدمیوں کو ہمارے پاس لے آیئے۔" فرحت اللہ بیگ نے ان سے کہا۔ "لیجئے آپ دونوں حضرات کو

عزیز صاحب بلا رہے ہیں۔"

ظریف نے پوچھا۔ "عزیز صاحب کہاں ہیں؟"

فرحت اللہ بیگ:۔ یہ کیا سامنے بیٹھے ہیں۔

چنانچہ ظریف کے قریب پہنچنے پر عزیز نے ان کی سرو قد تعظیم کی اور اپنی جگہ پر بٹھا کر خود ذرا سا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

حالی ابھی کھڑے فرحت اللہ بیگ سے باتیں کر رہے تھے کہ رشید صاحب اور اکبر الہ آبادی آتے ہوئے دکھائی دیئے فرحت اللہ بیگ ان کی طرف بڑھے۔ حالی، رشید اور اکبر کو برق کے پاس جہاں بہت کافی جگہ تھی بٹھا دیا۔ ان کو بٹھا کر جو مڑ کر دیکھتے ہیں تو سرور اور چکبست داخل ہوئے۔ فرحت اللہ بیگ ان کے لینے کو بڑھے کہ برق نے کہا "مرزا صاحب سرور صاحب کو ہمارے پاس بھیج دیجئے گا۔"

حالی:۔ ہاں ہاں یہیں بلائیے۔"

فرحت سرور اور چکبست کو ساتھ لئے ہوئے بڑھے بیچ میں اکبر نے چکبست کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اجی پنڈت جی یہاں بیٹھئے۔" سرور برق کے پاس بیٹھ گئے۔

دفعتہً تمام محفل میں ایک قسم کی لہر سی پیدا ہوئی کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں بادشاہ ظفر شاہ اور اختر شاہ دونوں ساتھ ساتھ نہایت سادگی اور خندہ پیشانی سے باتیں کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں ان کے پیچھے پیچھے جناب شاد عظیم آبادی

سہ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز چونکہ حضرت ظریف مرحوم کے بڑے بھائی لسان القوم مولانا صفی مرحوم کے شاگرد تھے اس واسطے اپنے استاد کے بھائی کی تعظیم کرنا ان کا اخلاقی فریضہ ہے۔

بھی ہیں۔ ان کے داخلے پر آزادؔ، شبلیؔ اور فرحت اللہ تینوں آدمی بڑھے دونوں شاہوں کی تعظیم کو سوائے میرؔ تقیؔ، انیسؔ، محسنؔ، ناسخؔ کے جو بادشاہوں کی تعظیم کو کمال کے مقابلہ میں لازم نہیں سمجھتے تھے سبھی اُٹھے۔ ان لوگوں نے زندگی دنیا میں بھی کبھی بادشاہوں سے توسل نہیں رکھا تھا یہاں کیوں کسی کی تعظیم کرتے۔ میزبان کہتے ہیں کہ صدر میں چلئے لیکن بادشاہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی صف شعراء میں ایک طرف بیٹھ جائیں کہ حضرت ولیؔ اللہ نے اپنے دکلار کو آواز دی "یوہ شاہان کون کس کارن صدر میں نہیں ٹھلاتے ہو؟"

آزادؔ:۔ "حضرت! ہم نے تو عرض کیا تھا کہ حضور والا صدر میں تشریف رکھیں لیکن حضرت ظل اللہ زمرۂ شعراء میں تشریف رکھنا پسند فرماتے ہیں۔"

ولیؔ:۔ جب اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے یوہ شاہان کو جگ منے نت مسند نشیں و تخت نشیں ہی رکھا سوں اس جا بھی مسند نشیں ہی ہونا لازم اچھے! حضرات ہمن کے قریب منے تشریف لادیں۔"

دونوں بادشاہ ولیؔ کی بات سن کر مسکراتے ہوئے ولی کی طرف بڑھے جو انکی تعظیم میں کھڑے ہوئے تھے ادھر شادؔ کو چکبستؔ نے اپنے قریب بلالیا، ابھی دونوں بادشاہ بیٹھے بھی نہ تھے کہ فانیؔ اور ان سے کچھ پیچھے ریاضؔ بھی محفل میں داخل ہوئے۔ فرحت اللہ نے جلدی سے ان کو بھی شادؔ ہی کے پاس پہونچا دیا۔

ادھر ولی اللہ نے دونوں بادشاہوں کو اپنی مسند ہی پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا خود ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اب سب لوگ ذرا اطمینان سے بیٹھے ہی

تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نئی صورت عجب مورت اس ہیبت گذائی سے نمودار ہے کہ :-

[گلابی اطلس کا بڑی بڑی مہریوں کا بڑ کے پائینچہ کا پائجامہ، اودے گرنٹ کی گوٹ۔ گہرے نارنجی رنگ کا کرتا۔ کرتے کی آستینیں چنی ہوئی ہیں اور چھپے چھپے کف جن میں تین تین بٹن لگے ہیں۔ کامدانی کے کام کی دوپلی ٹوپی ڈلا ایسی چمکدار ایک ہلکا فالسائی رنگا ہوا جنگل باڑی کا مہین دوپٹہ مقیش کے آنچل پلو ٹکے ہوئے چاروں طرف کنارے پر تیلا لچکا کامدانی کے پھول بیچ میں کڑھے ہوئے خوب چنا ہوا اور سہاگ کے عطر (عطر عروس) میں گویا ڈوبا ہوا گلے میں ڈالے چلے آرہے ہیں، شکل یہ ہے کہ لمبی لمبی کھچڑی مونچھیں مہین خشخاشی ڈاڑھی۔ کاکلیں کندھوں پر پڑی آنکھوں میں سرمہ ہے۔]

ان کے آتے ہی کچھ پر ہنسی کی مسکراہٹ کچھ چہروں پر تنفض کے آثار نمودار ہوئے۔

دونوں بادشاہ، جرأت، مصحفی، رنگین، داغ، برق، بحبت اور ظریف تو مسکرا دیے مگر غالب، جلال، ناسخ، حالی کے چہروں پر تنفض کے آثار دیکھ کر حضرت ولی اللہ نے کہا!

ولی :- آؤ! آؤ!! میر یار علی جان آؤ۔ بھئی ہم تو تم کا انتظار دکھتے تھے بہوت تاخیر کر دی۔

ان کو دیکھ کر آزاد بڑھے اور آتش کے مقابل دوسرے بازو پہ امیر مینائی

سے پہلے جو جگہ خالی تھی وہاں بٹھا دیا اور کہا۔

آزاد :۔ جناب جان صاحب آپ کے بغیر ہمارا مشاعرہ ناقص رہتا آپ کا کلام ایک اہم جزو زبان دانی کا ہے جس طرح مجلس اقوام عالم میں ہر قوم کی نمایندگی من حیث القوم لازمی ہے بالکل اسی طرح مجلس ادب و زبان دانی میں صنف نازک کی زبان کی نمایندگی آپ کے کلام سے ہے۔"

ولی نے آزاد کو اپنے داہنے بازو پر شبلی کو اختر اور ثاقب کے درمیان جگہ میں گاؤ تکیہ سے کسی قدر پیچھے بٹھالیا، فرحت اللہ بیگ کو آزاد کی زبانی پر حکم دیا کہ وہ جان کے مقابل داہنے ہاتھ کی قطار کے ختم پر بیٹھ جائیں۔

پھر ولی نے آزاد سے کچھ پیچھے مڑ کر چپکے چپکے کان میں کہا۔

(پردہ گرتا ہے)

(ڈراپ سین)

سین چھٹا

تکمیل ــــــــ مشاعرہ

آٹھ بجنے کے ساتھ ہی آزاد کھڑے ہوتے ہیں اور یہ تقریر بلند آواز میں کرتے ہیں:۔

"اے عندلیبانِ چمن سخن وری وائے زندہ یا فان گلزار شاعری اس گلشن نظم اردو کے باغبان اور اس قصر شاعری کے پاسبان حضرت ولی نے ہم لوگوں کو بحیثیت اپنے پیش دست کے حکم دیا تھا کہ اس مشاعرہ کا انتظام کریں یہ بھی حضرت موصوف کا حکم ہے کہ جس طریقہ پر آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں اس سلسلۂ نشست کا خاص منشاء بھی ظاہر کر دیا جائے جناب سامی کا مقصد یہ ہے کہ زبان اردو کی شاعری اپنے تربیت کرنے والوں کی عہد بہ عہد کی کاوشیں دیکھ کر اپنے مربیوں کا امتنان و تشکر ادا کرے اور اپنی رفتار کو (جو سراشیب زوال پر اس کو لئے جا رہی ہے) بدل کر معراج کمال پر پہونچنے کے لئے بلندیٔ خیال اور بلندیٔ مقال کے زینوں پر چڑھنے کا موقعہ نکالے۔

اس محفل میں بارہویں صدی ہجری کے شعراء بالکل شروع میں تشریف رکھتے ہیں اس کے بعد تیرہویں صدی پھر چودھویں صدی کے اہل سخن میں یہاں غزل مثنوی، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مستزاد، مرثیہ وغیرہ کا کچھ التزام و پابندی نہیں ہے جس استاد نے جس صنف کلام میں کمال دکھایا ہے یہاں اس کا

مظاہرہ کرے، اسی غرض سے کوئی طرح نہیں رکھی گئی ہے، مشاعرہ کی ابتدا بادشاہ ملک معانی کے کلام سے جو سر آمد شعراء ہیں ہیں (گیارہویں صدی کے) ہوگی ان کے کلام کے بعد اسی ترتیب سے جس طرح کاملین فن بیٹھے ہیں، یعنی استادان سخن یہاں عالم ارواح میں آئے ہیں اپنا اپنا کلام ارشاد فرمائیں گے تاکہ عہد بہ عہد کی ترقیاں اور کاوشیں ظاہر ہوں۔

چونکہ ان دونوں بادشاہان دنیا نے عالم آب وگل میں اردو شاعری کی سرپرستی اپنے پیش روؤں سے زیادہ کی اور تاجداران ملک معانی کی طرح زبان کو اپنی آغوش عاطفت میں پرورش کیا اور ہماری تہذیب و شائستگی جس کا اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے انھیں کے درباروں کی سرپرستی کی ممنون احسان ہے اُن کی اعانت دنیا میں بھی ہوتی رہی اس لئے یہاں بھی انکا روحانی فیض زبان کو حاصل ہونا بس ضروری ہے۔

بادشاہ مملکت معانی کے کلام سے شروع ہو کر پہلا دور بادشاہان ملک فانی کے کلام پر ختم ہو جائے گا تاکہ روحانی اور جسمانی سرپرستی زبان کی ظاہر ہو۔ بعد ختم دور مشاعرہ خیر الاذکار باعث تزئینِ محفل ہوگا تاکہ برکت مدح رسول وآل پاک سے ہم سب کی دعائیں اپنی زبان و تہذیب کے حق میں مستجاب ہوں لہذا اب مشاعرہ حضرت ولی کے کلام سے شروع ہوتا ہے۔"

(اس تقریر کے بعد مولانا آزاد نے ایک شمع دان کنول چڑھا ہوا جو گاؤ تکیہ کے پیچھے چھپا ہوا تھا اٹھا کر ولی کے سامنے رکھ دیا۔ مولانا شبلی نے اس کا کنول اٹھایا ولی اللہ نے اس کو روشن کر دیا شبلی نے کنول چڑھا دیا

ولی اللہؒ ۔ (دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ الخیر پڑھتے ہیں) بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ..... الخ

(تمام حاضرین چپکے چپکے تلاوت کرتے ہیں کسی کی آواز سنائی دیتی ہے کسی کی نہیں)

فرحت اللہ بیگ فاتحہ پڑھتے ہیں اپنے داہنے ہاتھ کے سامنے گوشے کی طرف بہت غور سے دیکھ رہے ہیں، سورۂ فاتحہ ختم ہوتے ہی یہ اسی طرف استقبال کو بڑھے ادھر سے ایک صاحب آتے دکھائی دئیے فرحت اللہ بیگ سے سلام علیک کے بعد مصافحہ ہوا۔ یہ ان کو لے کر جوں ہی سامنے آئے کہ شبلی نے پہچان کر پورے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

شبلی:۔ دیکھئے حضرات! بڑی مسرت کی بات ہے کہ دور آخر کے پیغمبر شاعری

لہ ولی اللہ ولی کے نام، ولادت، وطن، وفات سب زیر بحث ہیں۔ نام:۔ کوئی شمس الدین کوئی شمس الدین شمس الحق، کوئی حاجی ولی کوئی شمس ولی اللہ کوئی محمد ولی۔

سال ولادت:۔ کسی نے ۱۰۸۰ھ لکھا ہے کسی نے ۱۰۹۳ھ۔ احسن مارہروی نے ۱۰۷۰ھ تحریر کیا ہے۔ یہ صحیح سمجھا جاتا ہے۔

وطن:۔ اگر ایک مورخ احمد آباد کو یہ فخر بخشتا ہے تو دوسرا گجرات کو یہ عزت دلواتا ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ خاک اورنگ آباد کو ولی کے مسقط الراس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ولادت کی طرح سنہ وفات بھی معرض بحث میں ہے ۱۱۵۵ھ ایک مصنف تاریخ کی رائے ہے دوسرے مورخ صاحب ۱۱۱۹ھ پر اڑے ہوئے ہیں مولوی عبد الحق بھی اپنی رائے ۱۱۱۹ھ ہی پر دیتے ہیں۔

یہ چاروں باتیں اگر تحقیق کرنا ہو تو انہی ولی سے پوچھ لو خود موجود ہیں۔

ولی کو سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دہلی میں آئے تھے سورت و احمد آباد کا سفر بھی کیا ہے اور کافی مدت تک وہاں قیام بھی کیا ہے۔ کلام سے ظاہر ہے کہ فارسی

(باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

حضرت صفی لکھنوی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے یہاں موجود ہونے کی تو کوئی خبر ہی نہ تھی۔"

ظریف :۔ "مولانا! مجھ سے بھائی صاحب سے ابھی یہاں آتے وقت ملاقات ہوئی میں نے ان سے ذکر کر دیا تھا کہ حضرت ولی کے منعقدہ مشاعرے میں جا رہا ہوں۔ اس مشاعرے کی اہمیت کا بھی مجملاً ذکر کر دیا تھا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مولانا صفی فرحت اللہ بیگ کے ساتھ داخل محفل مشاعرہ ہوئے۔ سب ساتھی (جلال سے لے کر ثاقب تک) تعظیم کو کھڑے ہو گئے صفی نے ولی کو اور پھر دیگر اساتذہ کو سلام کر کے چاہتے تھے کہ فرحت اللہ

(صفحہ ۱۰۸ کا بقیہ) عربی میں دست گاہ تھی ان کے کلیات سے ہر صنف کلام پر ان کو قدرت رکھنے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ غزلوں میں تغزل کے علاوہ اخلاقی مضامین بھی موجود ہیں۔ مضمون آفرینی میں تخیل کی گہرائی قابل دید ہے۔ کہیں کہیں تصوف کے نکات موجود ہیں۔ برسوں خانقاہ میں اعتکاف کیا ہے۔ اور درس معرفت لے چکے ہیں اس لئے معنویت کے ساتھ پرلطف طریقہ سے رموز حقائق کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے زبان عموماً صاف و شیریں۔ پرانے نامانوس الفاظ اکثر کہیں کہیں الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ کہیں فارسی کی خوبصورت ترکیبیں۔ کہیں ہندی و فارسی کے مختلف الفاظ کی آمیزش سے کلام آراستہ و دلکش ہو گیا ہے۔

صفائی نظم، سلاست بیان ہر ہر جگہ نمایاں ہے غزلوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے۔ پھر بھی برجستگی اور کیف سے بیان میں مزہ کا فی ملتا ہے۔ ان کو بھی رعایت لفظی کا چسکا ہے مگر زبردستی کی رعایت لفظی نہیں برتتے۔

کے پاس ہی بیٹھ جائیں کہ ثاقب بڑھے اور صفی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچ لے گئے اور اپنے بعد ظفر شاہ کے پہلے بٹھا دیا۔

ولی:۔ (صفی سے مخاطب ہو کر) ہمن کوں تمھارے غیر مترقبہ درود سوں بہت خوش ولی ہوئی۔

صفی:۔ (سلام کر کے) دُنیا رہنے کا مقام نہیں ہے۔ صرف برتنے کی جگہ ہے عرصہ سے آپ حضرات کی ملاقات کا اشتیاق تھا یہاں آکر روح کو بالیدگی اور قلب کو مسرت حاصل ہوئی۔

سید علی نقی صفی مرحوم لکھنوی

[ولادت لکھنؤ ۲ جنوری ۱۸۶۲ء   وفات لکھنؤ ۲۵ جون ۱۹۵۰ء

سوانح سید علی نقی اسم گرامی اور تخلص صفی تھا۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا سید تفضل حسین صاحب مرحوم شاہزادہ سلیمان قدر بہادر کے معتمد خاص تھے۔ صفی نے فارسی و عربی درسیات حافظ علی بھروی اور احمد علی محمد آبادی اور اپنے عم محترم مولانا سید حسین صاحب سے حاصل کئے۔ طب حکیم باقر حسین صاحب سے پڑھی۔ ۱۲ سال کی عمر میں نائٹ اسکول میں انگریزی پڑھنا شروع کی اور ایک سال بعد کیننگ کالجیٹ اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۱۸۸۲ء میں محکمہ دیوانی میں ملازم ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں ججی کی پیشکاری سے پنشن پائی مختلف حادثات نے صحت خراب کر کے گوشہ نشینی کرنے پر مجبور کر دیا ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کا یہ آفتاب شاعری مغرب قبر میں ہمیشہ کے لئے

غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

تبصرہ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن وہ خاص طور سے اپنی مثنوی اور قومی نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ صفی حالی اور شبلی کے ہم عصر تھے اور لکھنؤ کے شعراء میں سب سے پہلے استاد ہیں جنھوں نے اپنے فن سے وہ کام لیا جسے مقصدی اور اصلاحی کہہ سکتے ہیں انکی شاعری محض تفنن طبع کی غرض سے نہ تھی، اقبال و حالی کی طرح سوتی قوم جگانا، غافلوں کو درس بیداری دینا ان کا حاصلِ شاعری تھا، ان کی اپیل کا دائرہ حالی اور اقبال کے دائرہ سے بھی زیادہ محدود تھا۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ ان باکمالوں سے زیادہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور ان کی نظموں کے اثر نے شیعہ کالج اور یتیم خانہ کی مستحکم و استوار عمارتوں کی صورتیں اختیار کرلیں گویا شاعر کے خواب نے تعبیر کا جامہ پہن لیا۔

آپ کی نظمیں مختلف رسائل میں برابر نکلا کرتی تھیں بالخصوص شیعہ کانفرنس کے ہر اجلاس میں آپ کی نظم "لختِ جگر" کے نام سے آپ خود سُناتے تھے۔ آپ مشاعروں میں برابر شرکت کرتے تھے مگر پیرانہ سالی کے زمانہ میں شرکت مشاعرہ بہت کم کردی تھی۔ حضرت صفی نے لکھنؤ کی شاعری کے اسکول کو تمام عیوب سے پاک و صاف کر دیا۔ آپ کے کلام میں نہ بے جا مبالغہ ہے نہ بدنما رعایت لفظی۔ آپ کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور عروض و معانی و بیان پر پورا عبور، سادگی

فصاحت و بلاغت آپ کے ہر شعر سے نمایاں ہے۔

صفی کے کلام کی خصوصیت زبان کی سادگی، طرز ادا کا زور، محاورات روز مرہ کی شگفتگی، تشبیہات کی جدت ہے، آپ نے اپنی قومی نظموں میں مختلف مقامات کے تاریخی اور جغرافیائی حالات نہایت ہی دل کش پیرایہ میں نظم کئے ہیں۔

فلسفۂ حیات اور موجودہ عہد کے اہم مسائل پر بھی آپ کا کلام نہایت آسانی کے ساتھ چراغِ ہدایت بن سکتا ہے۔ آپ صاحب طرز استاد ہیں آپ کے مذاق سلیم نے آپ کے طرز کی پیروی کرنا متعدد شاعروں کو سکھلا دیا اور جس نے اس طرز کی پیروی کی وہ آسمان کا شاعر بن گیا۔

افسوس کہ یہ باکمال استاد بھی تیر اجل سے محفوظ نہ رہا، اور ۲۵ جون سنہ ۱۹۵۰ء کو اپنے مکان مسکونہ واقع رسی بٹان بوقت شب داعی اجل کو لبیک کہا اور امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ میں راجہ نواب علی خاں مرحوم کے مزار کے پاس آغوش قبر میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ اس باکمال ہستی کے اُٹھ جانے سے سرزمین لکھنؤ باکمال ادیب و شاعر سے خالی ہو گئی۔

ان کی تصنیف "مثنوی تنظیم الحیات" اخلاقیات جیسے خشک موضوع پر ہے۔ لیکن حلاوت زبان اور شیرینئ بیان نے اس وادئ خشک میں بھی دودھ اور شہد کے دریا بہا دیے اور یہی وہ نظم ہے

جو ہندوستانی اکاڈمی یو پی کی نظر میں قابلِ انعام ہوئی اور اس زمانہ کی بہترین تصنیف قرار پائی۔]

وؔلی:۔ صاحبو! ہم بوڑھے کے بچن بیچ تم صاحبان کی من طبیعت داری کجا اچھے تیر تم سب کے اصرار سوں ہم کچھ سُنائے دیتا ہوں۔

غزل[1]

کیا مجھ عشق کے طالب کو آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گُل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری میں دلبر کی بجھایا آتشِ غم کوں
کہ گرمی دفع کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

مرے دل کو کیا بے خود تری انکھیوں نے اے ظالم
کہ جوں بیہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سے اے آتشیں رُو دل مرا پانی
کہ جوں گلتا ہے آتش میں گلاب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سے آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سے
کہ جوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں دلبر سوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

وؔلی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جوں انکھیوں میں آجاتا ہے خواب آہستہ آہستہ

مطلع سن کر جلالؔ نے ناسخؔ کی طرف دیکھا۔ ناسخؔ نے سر جھکا لیا ("آب اور گلاب" میں ایطاء صاف صاف ظاہر ہو رہا ہے) دوسرے شعر پر دردؔ اور مصحفیؔ نے نزاکت

۱؎ یہ غزل دہلی میں کچھ دن رہ کر جب دکن واپس آئے ہیں اس کے بعد کی تصنیف ہے۔ بہت سے الفاظ جو دلی گفتگو میں بے دھڑک بول جاتے ہیں وہ اس غزل میں قصداً ترک کئے ہیں جیسے اچھے رہے۔ سوں۔ سے۔

مضمون کی تعریفیں کیں تیسرے شعر پر میر، سودا، آتش، غالب نے بہت بیقراری سے تعریف کی۔ میر نے دوبارہ پڑھوایا۔ چوتھے شعر پر لکھنؤ اسکول کے بہت شعرا اور مصحفی، ناسخ، آتش، تعشق، امیر، داغ، جلال، شاد، مومن، بھی بہت تعریف کرتے ہیں۔ پانچویں شعر پر میر، سودا، درد، حسن، بالکل بے حال ہوئے جاتے ہیں۔ چھٹے شعر پر تو مشاعرہ بھر میں ایک دھوم مچ گئی ہر طرف سے "دوبارہ زحمت کیجئے۔" "پھر ارشاد ہو" کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، کئی کئی بار پڑھوایا گیا۔ غزل ختم ہونے پر میر نے بہت ادب سے کہا "عجب کچھ لطف دیتا ہے۔۔۔۔ پھر ایک بار ارشاد ہو، اس سے سیری نہیں ہوتی، ولی پھر پڑھتے ہیں۔

میر:۔ اس نمط کا ریختہ کہنا محال ہے یہی عرض حال ہے۔ ولی مسکراتے جاتے ہیں جب تعریفوں کا ہنگامہ موقوف ہوا تو ولی نے سودا کو اشارہ کیا۔

ولی:۔ مرزا رفیع! بسم اللہ

سودا:۔ (اٹھ کر مؤدبانہ سلام کرتے ہیں) میری کیا مجال جو آنجناب کے بعد کچھ عرض کروں لیکن الامر فوق الادب دور مشاعرہ ہے اس سے مجبور ہوں (چاہتے ہیں کہ ولی کے آگے سے شمعدان اٹھالیں)

مولانا آزاد:۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں شمع حاضر کرتا ہوں۔

سودا:۔ بہت بہتر ہے آپ ہی شمع اٹھا دیجئے۔ آپ کا دیا ہوا چراغ تو گذشتہ اور آیندہ سب حالات روشن کر دے گا۔

آزاد:۔ معاذ اللہ! میں کہاں اس لائق ہوں، آپ ہی حضرات کا کلام مشعل راہ

ہوا جس سے میری کا لجہ آنکھیں کھلیں۔

(شمع اٹھا کر سودا کے سامنے رکھ دیتے ہیں)

سودا:- (ولی سے اجازت لے کر) عرض کرتا ہوں۔ (تحت اللفظ)

غزل ؎

بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی
یہ خواب زلیخا کی تعبیر نظر آئی

دے نالے جو موم اکثر کرتے ہیں پہاڑ دل کو
انگی نہ ترے دل میں تاثیر نظر آئی

دل دینے پہ جو چاہے تعزیر کرو ہم پر
اس امر میں اپنی ہی تقصیر نظر آئی

ہے گردشِ چشم اس کی حلقہ درِ محشر کا
موجِ خطِ پیشانی زنجیر نظر آئی

کی عمر عبث ضائع خدمت میں مہوس کی
خاک اپنی ہی جب چھانی اکسیر نظر آئی

صنعت کے مصور نے کھولا جو مرقع کو
اک اس میں نہ تیری سی تصویر نظر آئی

مستوں کا سخن ہم کو سودا یہ بہت بھایا
واعظ کی تو باتوں میں تذویر نظر آئی

دوسرے اور تیسرے شعر کی تعریف میر صاحب اور حسن نے خوب کی چوتھے شعر پر مصحفی پھڑک اٹھے۔ پانچویں شعر کو میر صاحب نے دوبار پڑھوایا۔ چھٹے شعر پر تمام مشاعرہ تہ و بالا ہو گیا، ہر طرف سے تعریفیں ہو رہی ہیں، پھر پڑھیئے پھر پڑھیئے کی آوازیں بلند ہیں۔ ساتویں شعر (مقطع) پہ غالب، مومن، ذوق بہت تعریف کرتے ہیں۔

؎ اکثر تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غزل تقریباً آخر عہد سودا کی ہے۔

(سودا کے ختم کرنے کے بعد اور تعریفوں کے شور وغل فرو ہونے کے بعد آزاد کھڑے ہوتے ہیں)

آزاد:۔ (کھڑے ہو کر) واہ صاحب! آپ کے کلام کا زور اور مضمون کی نزاکت آپس میں یوں دست و گریباں ہیں جیسے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔

سودا نے ختم کرنے کے بعد کنول درد کی طرف بڑھایا۔ ادھر دلی نے درد سے کہا، بسم اللہ خواجہ درد صاحب۔

درد:۔ (دست بستہ دلی سے) بہت خوب تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ (سودا سے) معاف کیجئے گا یہ دور مشاعرہ المامور معذور۔

سودا:۔ واہ صاحب اس میں معافی کاہے کی ہے اور پھر آپ کا کلام ہمہ تن درد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

درد:۔ (مسکرا کر) آپ کا حسنِ ظن ہے من آنم کہ من دانم۔ ملاحظہ ہو۔

(نوٹ) ان کی آواز فطرتاً دردناک ہے تحت اللفظ پڑھتے ہیں مگر ایک درد انگیز لہجے میں)

غزل

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

مطلع سن کر سب بولے کیا سچا مضمون ہے۔ ولی نے بھی گردن ہلا کر تعریف کی "بہوت خوب اچھے۔" (درد نے ولی کو مؤدبانہ سلام کیا) دوسرے، تیسرے شعر میں خاص میر کا رنگ تھا۔ انھوں نے بہت پسند کیا۔ سب نے تعریف کی چوتھا شعر ناسخ اور ان کے ہم خیالوں کو پسند آیا۔ پانچواں شعر غالب، مومن، ذوق پسند کرتے ہیں، چھٹے شعر پر تو غالب بے چین ہو گئے ادھر تعشق، جلال، رشید آتش و سودا نے بہت تعریف کی، غالب نے دوبارہ پڑھوایا۔

آزاد:۔ "سبحان اللہ خواجہ صاحب! آپ نے تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔

درد اظہار تشکر کر کے شمع حسن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ حسن دست بستہ "میری کیا مجال جو استاد المعظم کے بعد کچھ عرض کر سکوں۔"

درد:۔ (شفقت کے لہجے میں) نہیں میاں! پڑھو! بھئی یہ تو مشاعرے کا ورد ہے یہاں بزرگی و خوردی استادگی و شاگردی کا لحاظ نہیں ہوتا، حضرت کا حکم ہے اور دور مشاعرہ ہے۔ ضرور پڑھو۔

ولی، سودا، میر، مثنوی سحر البیان کے چند اشعار پڑھنے کا اصرار کرتے ہیں۔

آزاد:۔ جی ہاں حسن صاحب! مثنوی آپ کی زبان سے سننے کا سب کو اشتیاق ہے۔ حضرت یہ تو وہ کارنامہ ہے کہ زبان اردو میں ابتدائے شاعری سے

اس وقت تک اس کا جواب نہیں ہو سکا۔

شبلی:۔ اور آیندہ بھی اس کا مثل ہونے کی اُمید معقود ہے۔

حسن:۔ (مثنوی سحر البیان کھول کر سنبھل کر بیٹھتے ہیں) یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

(داستان بے قراری بدر منیر کی بے نظیر کے فراق میں) از مثنوی "سحر البیان"

پلا ریا تھا ساغر بے نظیر — پھنسی دام ہجراں میں بدر منیر
وہ حسن وجوانی اور اس پر یہ غم — ستم ہے ستم ہے ستم ہے ستم
جہاں بیٹھنا آہ کرنا اُسے — بہانہ نزاکت پہ دھرنا اُسے
کبھی خون آنکھوں سے رو ڈالنا — کسی کو کبھی دیکھ دھو ڈالنا
خواصوں کو بالا بتانا اُسے — اکیلے درختوں میں جانا اُسے
وسے اُن درختوں میں جنہیں وہ ماہ — سر شام چھپ چھپ کے کرتا نگاہ
سو وہ بھی بہر دل سے واں آرام — اُسی چھاؤں میں بیٹھ کرتی تھی شام
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے — محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے — تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

بے قراری بڑھتی ہے

زباں پر تو باتیں، دلے جی اُداس — پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منھ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سَر کی خبر نہ بدن کی خبر
جو مِسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی — جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں — جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سبھاؤ
کہ بگڑے سے ہوتا ہے ان کا بناؤ

(شہزادہ لبِ بام سے غائب ہو گیا خواصوں کی پریشانی)

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دل گیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں سے داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
لبِ بام کثرت جو بے حد ہوئی — تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

(آصف الدولہ کے عہد میں شریف زادوں کی وضع)

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک — بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں — کہ جوں عکسِ مہ زیرِ آبِ رواں
دھرا اک سر پہ پھینٹا سجا — ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
دو موتی کی لٹکن زمرد کی ہڑ — لگے جس کی زیبندہ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ انگشتری — سراسر حنا دست و پا میں لگی

اگر ما زلف کی اور کاکل کا بل

جوانی کی شب اور سماں برمحل

مثنوی ختم ہونے پر بہت زبردست .... واہ واہ کی آواز آئی کہ تمام مشاعرہ گونج اٹھا۔ ولی، سودا، درد اور میر کی تعریف پر حسن نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

آزاد :- "علاوہ حسن تعلیل کے اس مثنوی میں جذبات قلبی، واردات حسن و عشق ہجر و وصل مناظر قدرت بدرجۂ اتم موجود ہیں اور حقیقت میں یہ عہد نواب آصف الدولہ کی معاشرت اور طرز زندگی کا ایک ایک آئینہ ہے جس میں اس وقت کی معاشرت۔ سراپا، زیورات بیاہ شادی کے رسوم اہل حرفہ کی اصطلاحیں ان کی بولی ٹھولی کے ساتھ ساتھ قصہ کی دل چسپی داستان کا لطف صفائی و شستگی زبان دل پسند تفصیلیں۔ غرض تمام اوصاف و محاسن جمع کیے گئے ہیں اول سے آخر تک کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں۔"

[میر تقی میر :- آپ لوگ ان کو جو تھے سین میں ولی کی خانقاہ میں دیکھ چکے ہیں وہی لباس و شکل ہے۔ یہ بہت سنجیدہ اپنے آپ کو لیے دیے رہتے تھے، نازک مزاجی کا پتہ تیوری کے بل دے رہے ہیں پیدائش ۱۱۳۶ھ میں ہوئی دس سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا (اکبر آباد) وطن ترک کرنا پڑا۔ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین حسن خاں آرزو کے پاس دہلی چلے گئے۔ وہاں ان کی اردو غزلیں بہت پسند کی گئیں۔ اور ملک بھر میں شہرت ہو گئی، شاہ عالم کے دربار میں ان کا کلام بڑے بڑوں سے

داد لیتا تھا۔ لیکن بقول آزاد خالی داد سے خاندان نہیں پلتا اور دہاں خزانہ سلطنت خالی تھا۔ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ پہونچے اور یہیں ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں پیوند زمین ہوئے۔ لکھنؤ میں جوبلی جونیر اسکول کے سامنے تکیہ پر مسجد کے نیچے قبر اب تک زیارت گاہ خواص و عوام ہے ہر کام نہایت متانت اور آہستگی سے کرتے تھے، آواز میں نرمی اور ملائمت۔ مزاج میں غیرت ضرورت سے زیادہ اور اس سے زیادہ بدمزاجی۔" انکی بددماغی کے سایہ میں دنیا و اہل دنیا سے بیزار بیٹھے رہتے تھے، فاقے کرتے، دکھ اٹھاتے اور اس لازوال دولت سرمایۂ سخن سے ہفت اقلیم کی سلطنت کو ہیچ سمجھتے تھے" (آزاد) ۔ ان کی استادی کا اقرار ان کے ہمعصروں نے ہی نہیں کیا بلکہ دنیا اس وقت تک مانتی ہے کہ اردو شاعری میں ان سے زبردست غزل گو شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔" (کاشف الحقائق) "سوز و گداز، خستگی و قنوط، تشتریت، رنگینی، ملاحت شیرینی و شگفتگی، شوخی و سوز وغیرہ کی ترکیبیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔" (سیر المصنفین) " اس کے علاوہ وہ عشق کے واردات کو اس حسن سے بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ پاتے ہیں۔" (اعجاز حسین) اشعار میں سادگی و صفائی اتنی ہے کہ بلا غور و فکر دل میں سما جاتے ہیں اور قلب میں نشتر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ اسی واسطے ان کے ۷۲ بہتر نشتر مشہور ہیں لیکن وہ ۷۲ بہتر سینکڑوں سے زیادہ ہو گئے ہیں۔]

حسن نے سلام کرنے کے بعد اپنے آگے سے کنول اٹھا کر میر صاحب کے آگے رکھ دیا۔ میر صاحب سنبھل کر بیٹھے اور تمام محفل میں اشتیاق کلام کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔

ولی :۔ ہمن کوں تمھارے کلام کا قدرن اشتیاق رہتا اچھے۔

میر :۔ تعمیل ارشاد کو نذراں حاضر ہوں۔

مصحفی نے انشاء کو (جو ابتک آشفتہ سری کے عالم میں گم سم بیٹھے تھے) چونکا دیا۔

مصحفی :۔ میر انشاء! دیکھئے حضرت میر اپنا کلام ارشاد فرمارہے ہیں۔

انشاء :۔ (چونک کر) اچھا! مشاعرہ شروع ہو گیا! ابھی میں پہلے پڑھ لیتا تو اچھا تھا بھلا میر صاحب کے بعد کیا موقع رہے گا۔

مصحفی :۔ الامر فوق الادب۔ جو حضرت ولی کا حکم ہو اس میں موقعہ محل کا کیا دخل۔ سنیئے۔

میر :۔ (ولی کے چشم و ابرو پہ نگاہ کر کے شروع کرتے ہیں) (تحت اللفظ)

غزل

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا ۔۔۔ حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے ۔۔۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک ۔۔۔ شیخ میخانے سے بھلا کھسکا

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب ۔۔۔ ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

بحر کم ظرف ہے بسان حباب ۔۔۔ کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا

فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا، آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

مطلع پر تمام اساتذہ پھڑک اٹھے واہ واہ کی صدائیں ہر طرف سے آ رہی ہیں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، حسنؔ، دردؔ، سوداؔ، آتشؔ، ناسخؔ سب نے متفق اللفظ ہو کر کہا "سہل ممتنع" یہی ہے۔ دوسرے شعر پر سوداؔ، ناسخؔ، آتشؔ حسنؔ، واہ واہ کیا ہی نادر تشبیہ ہے۔ تیسرے شعر پر مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ، ناسخؔ کیا خوب ایراد المثل ہے۔ کیا اعلیٰ طریقے سے معمولی قافیہ نظم ہوا ہے۔ چوتھے شعر پر غالبؔ ناسخؔ، کیا ہی لطیف حسن التعلیل اور استعارہ ہے۔ پانچویں شعر پر سوداؔ، دردؔ غالبؔ تعریف کرتے ہیں۔ چھٹے شعر پر مومنؔ، آتشؔ پھڑک اٹھتے ہیں۔ مومنؔ۔ "حضرت اس سے ہنوز سیری نہیں ہوئی ایک بار پھر ارشاد ہو"۔ ساتویں شعر (مقطع) پر تمام شعراء ہنگامہ آرا تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا سچا مضمون ہے۔ کیا واقعیت ہے واہ! واہ!! سے پوری محفل گونج رہی ہے۔

حضرت دلی:۔ "تقی میاں! حقیقت میں تم نے تو نہایت حسن طرز ریختہ کی پابندی میں کامیاب ہوئے رہے ہو۔

میرؔ:۔ اٹھ کر مودبانہ سلام کرتے ہیں۔

آزاد:۔ "سبحان اللہ! زبان کی شستگی۔ کلام کی صفائی، بیان کی پاکیزگی۔ جیسے باتیں کر رہے ہیں کہیں تکلف نظم نہیں "سہل ممتنع" یہی ہے دل کے خیالات کو محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیا ہے زبان میں وہ تاثیر ہے کہ

وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں جن کی اصلیت قائم رہتی ہے حزن و سوز سے دلوں کو گداز کرنا آپ ہی کا کام ہے۔"

شبلی۔ ایں سعادت بہ زور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شبلی و آزاد کی تنقید ختم ہونے کے بعد جب اہل مشاعرہ کی کیفیت وجدانی کم ہوئی تو جرأت نے ٹٹول کر کنول اٹھانا چاہا، آزاد نے کنول بڑھایا اور باآواز بلند کہا۔ "بسم اللہ جناب جرأت۔

جرأت :۔ (دست بستہ میر صاحب سے) اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کر دوں۔

میر صاحب :۔ بھئی ضرور پڑھو! اجازت کا کیا ذکر ہے جب حضرت ولی اللہ کا حکم ہے تو پھر دوسرے کی اجازت کیسی؟

جرأت :۔ شعر کیا ہیں بقول آنجناب وہی چوما چاٹی کی باتیں ہیں۔" لیکن حضرت ولی اللہ کا تعمیل ارشاد ہے جو جسارت کر رہا ہوں۔

میر صاحب :۔ نہیں بھئی کیا ہوا پڑھو پڑھو اپنا اپنا طرز ہے۔ جسارت کاہے کی۔

جرأت :۔ (خوش آیند ترنم کے ساتھ) (مستزاد) سراپا کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

غزل مستزاد

جادو ہے نگہ، چھب ہے غضب، قہر ہے مکھڑا۔ اور قد ہے قیامت

غارت گر دیں وہ بت کافر ہے سراپا۔ اللہ کی قدرت

اٹھکیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات۔ ہر بات جگت ہے

اور رنگ رُخِ یار ہے گویا کہ بھبھوکا۔ پھر تس پہ ملاحت

ابرو نے خوں ریزی میں اس کے ہیں غضب طاق۔ شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا۔ افسوں ہے اشارت
دل خوں کرے وہ دست حنا بستہ پھرا ہیں۔ سمرن کی پھبن ہائے
ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا۔ شوخی و شرارت
گلشن میں پھرے ٹک تو دہیں آتش گل کی گرمی سے عرق آئے
ہر گام پہ چلنے میں کمر کھائے ہے لچکا۔ اللہ ری نزاکت
بھولے سے جو ہم نام لیں تو رک کے کہیں یوں۔ اس نام کو کم لو
پھر اس میں جو رک جائیں تو جھٹ سے یہی کہنا۔ بس دیکھ لی چاہت
جرأت یہ غزل گو چہ کہی ایسی ہے تو نے۔ ہے خوب سراپا
پر کہہ کے وہ اشعار کر اب اس کو دوغزلا۔ ہو جس سے کہ وحشت
جو اس سے کہا میں نے دکھا مجکو رخ اپنا۔ بس دے نہ اذیت
تو کیا کہوں کس شکل سے جھنجلا کے یہ بولا۔ تو دیکھے گا صورت
سودائے محبت جو نہیں ہے تجھے اے دل۔ تو پھر مجھے بتلا
کیوں چاک کئے اپنے گریباں کو ہے پھرتا۔ آنکھوں پہ ہے وحشت
دل دے کے عجب ہم تو مصیبت میں پھنسے ہیں۔ اک پردہ نشیں کو
نے جانے کا مگر اس کے ہے مقدور ہمارا۔ نے رہنے کی طاقت

انشا تو وقتاً فوقتاً بولتے رہتے ہیں باقی ان کی تعریف کرنے والوں میں زیادہ تر یہ لوگ ہیں:۔ نظیر، رنگین، شوق، جان، داغ، برق، سرور، چکبست، اکبر، آتش، مومن، ظریف، ثاقب، قریب قریب ہر شعر پر تعریف

ہوتی ہے۔ لوگ خوش و خرم ہیں۔ بہت جوش و خروش ہے۔

آزاد۔ واہ حضرت جرأت کیا کہنا۔ مسلسل غزل میں آپ سے زیادہ کون کامیاب ہوا

مستزاد کے تو آپ بادشاہ ہیں کلام میں صفائی اور سادگی خاص چیز ہے

محاورات کی بندش میں خوش مزاجی کا چٹخارا پھر شوخی اور بانکپن کی کیا تعریف

ہو سکتی ہے۔

[جرأت:۔ مشہور نام تو قلندر بخش ہے لیکن یہ عرف تھا اصلی نام یحییٰ امان

تھا۔ دہلی کی پیدائش غالباً ۱۷۴۳ء صحیح سنہ نامعلوم، فیض آباد میں

پرورش ہوئی۔ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں آ گئے۔

حسرت کے شاگرد۔ موسیقی میں کامل دستگاہ۔ علم نجوم میں خوب ماہر

علم موسیقی میں بہت شغف۔ نہایت ہنس مکھ۔ عین جوانی میں آنکھوں

سے محروم ہو گئے، مسلسل غزل کہنے میں مشہور مثل انشاء کے "معاملہ بندی"

ان کا طرۂ امتیاز ہے، رندی، سرمستی اور خواہش پرستی کی جیتی جاگتی

تصویریں کھینچ کر جرأت نے اپنا رنگ الگ قائم کر لیا۔ اگر ابتذال

کے پہلو سے کہیں کلام بچ گیا ہے تو لطف شاعری اور احساس محبت میں

مصحفی کا ہم مرتبہ ہو جاتا ہے۔ مرزا تقی خاں کے مکان پر مشاعرہ تھا میر

تقی میر بھی غزل پڑھتے تھے کہ وہاں جرأت ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے

آئے اور میر صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور کہا، حضرت اگرچہ آپ کے

سامنے غزل پڑھنی بے ادبی ہے مگر اس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی ہے

آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپ ہو رہے۔

جرأت نے پھر کہا میر صاحب پھر ٹال گئے۔ جب انھوں نے اصرار کیا تو میر صاحب بولے "تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، ہاں یہی چوماچاٹی کہہ لیا کرو" ۱۸۱۰ء / ۱۲۲۵ھ سنہ انتقال۔

وضع:۔ وہی اگلی۔ ایک رومال ڈیڑھ گز کا مربع کندھے پر، سر پر پگڑی، جسم میں نیمہ جامہ، کمر میں چادرا بندھا ہوا اسی میں رنگین رومال کھنسا ہوا۔ کلی دار رنگین پائجامہ، داڑھی اچھی خاصی، سفیدی جاری ہوئی کھچڑی، مونچھیں بڑی بڑی۔ گندمی رنگ، متوسط قد، گول بدن، آنکھوں سے معذور۔]

جرأت اپنے پڑھنے میں برابر ٹٹول کر انشاء اللہ خاں کو ٹھوکے پہ ٹھوکا دیے جاتے تھے اس وجہ سے اب انشاء خود فراموشی اور غفلت کے عالم میں نہیں ہیں۔

[انشاء:۔ میر انشاء اللہ خاں نام انشا، تخلص۔ تقریباً ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء میں بمقام مرشد آباد پیدا ہوئے ان کے والد حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر تخلص کرتے تھے۔ ان کے بزرگ بخف اشرف عراق سے آکر پہلے کشمیر میں متوطن ہوئے پھر سمرقند ہوتے ہوئے یہاں آئے، صحیح النسب خاندان سے تھے کشمیر سے دلی میں آکر طبیب شاہی ہوگئے سلطنت مغلیہ کی کمزوری نے ان کو مرشد آباد جانا پڑا۔ وہیں یہ اردو کا امیر خسرو پیدا ہوا، باپ سے پڑھا اور خداداد ذہنیت سے چند دن میں فارغ التحصیل ہوکر خاندانی پیشہ طبابت جو خاندانی طرۂ امتیاز تھا ترک

کیا۔ آخر میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، عربی، فارسی، ترکی، اُردو پشتو زبانوں پر عبور حاصل تھا اس میں شعر بھی کہتے تھے۔ سنسکرت کا بھی جانتے تھے۔ فن موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انشاؔ دہلی میں شاہ عالم کے زمانہ میں پہونچے۔ لیکن سلطنت دہلی کا بادشاہ شطرنج ہوگیا تھا تو یہ لکھنؤ چلے آئے سلیمان شکوہ کے دربار میں تھے کہ اودھ کے دربار میں پہونچے اور انتہائے عروج تک رسائی ہوئی۔ پھر "ہر کمالے را زوال" کا مصداق ہوکر آخرکار ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کو اقبال سے منھ موڑ کر خانہ نشین ہوگئے۔ تنہائی میں جنون نے رفاقت کی تا اینکہ اسی عالم میں ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء کو قید حیات وتقید شاہی سے آزاد ہوگئے۔

(جراءت کے پڑھنے کے بعد مصحفی نے جراءت کے آگے سے کنول اٹھا کر انشا کے آگے رکھا اور ذرا سا ان کو چونکایا۔ لیجئے سید صاحب کنول آگیا۔

انشاؔ:۔ اماں، کیوں جھنجھوڑتے ہو؟ ع

"کوئی بے ہوش ہے ہم دیر سے ہشیار بیٹھے ہیں"

منشی:۔ سید صاحب بسم اللہ آپ کا اشتیاق تو سب کو ہے۔ آپ بقول مولانا آزادؔ "اردو کے امیر خسرو ہیں" آپ کا دریائے لطافت حقیقت میں لطافت و زبان دانی کا سمندر ہے۔ کچھ ارشاد کیجئے۔

انشاؔ:۔ (کچھ دیر سوچنے کے بعد) تو بڑے میں ہاتھ ڈال کر تھوڑی دیر کچھ ٹٹولتے ہیں پھر ایک پرچہ نکال کر مغموم اور وحشت آمیز لحن کے ساتھ۔

غزل

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ زور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مطلع پر عجیب کیفیت ہوئی۔ کسی طرف سے آواز آئی پھر ارشاد ہو۔ مگر یہ کب سننے والے ہیں ایک نہ سنی دوسرا شعر شروع کر دیا۔ دوسرے شعر اور تیسرے

شعر پر ہر طرف سے تعریفوں کا تلاطم مچ گیا۔ دوسرے شعر کی فرمائش بھی ٹال دی اب دوبارہ پڑھوانے کو کوئی نہیں کہتا، یہ شعر کے پڑھنے کے بعد فقط آنا رکھتے ہیں کہ لوگ تعریف کریں۔ ولی، سودا، اور میر کی تعریف پر کچھ سوچ کر کبھی ذرا ذرا گھبرا کر ان لوگوں کو سلام کر لیتے ہیں باقی اپنے پڑھنے میں مشغول ہیں، یہاں ہر ہر شعر پر برابر تعریفیں ہو رہی ہیں۔ مگر ان کو کیا کسی کی طرف ہنس کر دیکھ لیا۔ کسی کا منھ چڑھا دیا۔ کسی کی طرف ایسا چہرہ بنایا کہ وہ ہنسی کے مارے بے تاب ہو گیا مگر یہ بندۂ خدا خاموش ہے چہرے پر ہنسی کا نام نہیں۔

غزل ختم ہوئی تعریفوں کا غل مچا ہوا ہے۔ ہر شخص تعریف کر رہا ہے اور لطف لے رہا ہے۔ آزاد کچھ تبصرہ کرنے کھڑے ہوئے تھے کہ انشاء نے پہلو سے اپنا توڑا اٹھایا۔ کھڑے ہو کر اس کو گلے میں پہنا۔ ہاتھ میں جو غزل کا کاغذ تھا اسکو وہیں پٹک کر جلدی سے چل دیئے نہ کسی کو سلام نہ اجازت رخصت۔ یہاں زمین آسمان میں سناٹا چھا گیا دیر تک لوگوں کے دلوں پر ایک کیفیت طاری رہی اور لبوں پہ مہر سکوت تا آنکہ میر تقی میر نے کہا ہائے کیا دماغ تھا اور کیا ہو گیا اب جو خاموش تھے افسوس کرنے لگے۔

ادھر ولی نے مصحفی کو اشارہ کیا۔ مصحفی نے وہ کنول جو انشا کے چلے جانے کے بعد خالی جگہ پر رکھا تھا اپنی طرف کھسکا کر سامنے رکھا اور ذرا سنبھل کر بیٹھے آتش، انیس، دبیر، مومن ان کا کلام بغور سننے کے لئے مستعد ہو کر بیٹھے مصحفی نے میر و سودا کے چشم و ابرو پر نظر ڈالی۔ (یہ میر کے پیرو ہوئے ہیں)

میر:۔ بسم اللہ پڑھیئے آپ نے تو میرا صحیح تتبع کیا ہے۔

مصحفی:۔ میں کس لائق ہوں۔ آپ کی ہمت افزائی ہے اس واسطے تعمیل ارشاد کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

[مصحفی:۔ غلام ہمدانی نام، پیدائش ۱۱۶۳ھ انتقال ۱۲۴۰ھ امروہہ وطن دہلی میں پرورش پائی لکھنؤ میں آکر نام پیدا کیا آصف الدولہ کا عہد تھا مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی کی سرکار سے متوسط رہے زمانہ اُن کو "جگت استاد" مانتا ہے بڑے بڑے نام بر آوردہ شاگرد پائے۔ وضع قطع بالکل میر تقی میر سے مشابہ ہے۔ سر پر پٹے ہیں داڑھی مونچھیں بالکل سفید (۸۰) برس کا سن سانولا رنگ، گول چہرہ۔

ان کی تعریف کرنے والے سودا، میر، درد، جرأت، ناسخ، آتش، نسیم ذوق، انیس، دبیر، تعشق، رشید، شاد، فانی، عزیز، ثاقب۔

یہ غزل مصحفی نے پڑھی

کون گلزار سے اے باد صبا جاتا ہے — رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے
دل دھڑکنے کا یہ عالم ہے کہ بے منت دست — پرزے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے
پوچھتا کوئی نہیں دیکھ کے رفتار تری — دل کسی کا ہے کہ پامال ہوا جاتا ہے
پوچھ کچھ صفحۂ ہستی پہ نہ حالِ انساں — ہے عجب نقش کہ خود آپ مٹا جاتا ہے
اس نے کیا چاک کیا پڑھ کے خط شوق مرا — خود بخود سینے میں دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے
ربط پہلے جو ترے یاد کبھی کرتا ہوں — بیٹھے بیٹھے مجھے افسوس سا آجاتا ہے

مصحفی عشق کے میداں میں گذر ہے کس کا
بھولا بھٹکا کوئی اس سمت بھی آجاتا ہے

ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے کبھی سوز کا انداز ہے کبھی میر کی تقلید ہے کہیں سودا کا ڈھنگ ہے۔ جب تمام شعراء مصحفی کی تعریفیں کر چکے اور مجمع میں سکوت ہو گیا تو اس کے بعد.....

آزاد۔ (کھڑے ہو کر) سبحان اللہ حضرت مصحفی کیا کہنا ہے آپ " جگت استاد " ہیں اردو زبان کی اصلاح حقیقت میں آپ کی ذات سے شروع ہوئی اور آپ ہی کے شاگردوں نے اس کی تکمیل کی۔ بہت سے عیوب زبان آپ ہی نے نکال ڈالے اردو کو قواعد و ضوابط کے حدود کا آپ ہی نے پابند کیا ملکی خصوصیتیں (LOCAL COLOUR) جس قدر آپ کے کلام میں ہیں کسی کے کلام میں نہیں اور دراصل آپ ہی نے اس خاص طرز کو ایجاد کیا سبحان اللہ مصحفی کے بعد میاں نظیر اکبر آبادی بیٹھے ہیں۔ مصحفی جب پڑھ چکے اور آزاد کی تقریر ختم ہوئی مصحفی نے کنول اٹھا کر نظیر کی طرف بڑھا دیا۔

حالی نے (ذرا بلند ہو کر) جناب نظیر صاحب۔ بسم اللہ

نظیر۔ بابا میرے شعر کیا ہیں فقیر کی بانی ہے ادھر سے چند آدمی (حالی، سرسید اکبر، برق) نے اصرار کیا ہم کو تو آپ کے بنجارے نامہ کا اشتیاق ہے۔ چند بند ضرور سنائیے۔

میاں نظیر نے بایاں ہاتھ کان پر رکھ کر ایک درد انگیز نہایت سریلی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

بنجارہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مولانا حالی پر ایک عجیب کیفیت ہے بے حد مسرور ہیں۔ سر ذرہ بے حد شدومد سے تعریف کر رہے ہیں "کیا بے ثباتی دنیا ہے۔" کیا خوب درس فنا دیا ہے سبحان اللہ

جان :۔ (رنگین سے مخاطب ہو کر) ادئی بہن! اے لو سنو یہ شعر ہیں کہ موئے چنے والی کی بانی۔

رنگین :۔ اے بوا وہی ہے جو بھیا انشاء نے کہا تھا۔

نہ فارسی، نہ عربی، نہ ترکی نہ ئے کی، نہ سم کی، نہ تر کی

نظیر :۔ دوسرا بند ملاحظہ ہو۔

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور ترا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقع سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مومن نے غالب کی طرف مخاطب ہو کر کہا: مرزا نوشاہ آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر غیر موافق الفاظ کو ایک رشتۂ نظم میں باندھا ہے۔

مرزا نوشہ :۔ یہ کمال قوت شاعری ہے۔

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا

کیا سود بڑھا کر لادے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا

دھن دولت ناتی پوتا کیا سب کنبہ کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

سب تعریف کر رہے ہیں حالی بے حال ہوئے جاتے ہیں کہ میاں ظریف بولے "سبحان اللہ کیا کہنا ہے تیر قضا کو ذرا موٹا کر کے موت کا بھالا خوب بنایا ہے۔

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے

یہ دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے

جب نایک تن سے نکلے گا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے

پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوہ ہے نہ مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

چند لوگ تعریف کر رہے ہیں اور میر صاحب ناسخ، آتش، ذوق مومن، وغیرہ دم بخود حیرت کے عالم میں بیٹھے سن رہے ہیں۔ میر صاحب نے مارے تنفر کے منھ پھیر لیا ہے مگر خاموش ہیں۔

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی

اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی

یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی

دھن پوت جوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اس بند کے پہلے اور تیسرے پھر چوتھے اور دوسرے مصرعوں کے قافیوں کو سن کر جلال نے ناسخ سے کہا "اے حضرت یہ کیا ہے؟"

ناسخ بولے :- "بھائی یہاں سب جائز ہے" جب کسی حد میں قدم رکھو تو اس کے واسطے قواعد و ضوابط کا ملحوظ رکھنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہر قید سے آزادی ہے۔

ادھر حالی، برق، ترور وغیرہ سب بہت تعریفیں کر رہے ہیں سب کی تعریفوں کے ختم کے بعد حالی کھڑے ہوتے ہیں۔

"سبحان اللہ نظیر صاحب! آپ کا کلام تو آپ کے عہد کی سیاسی، ادبی اور معاشرتی تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی ہے حقیقت میں آپ نے اپنے واسطے ایک شاہراہ الگ بنا رکھی ہے جس پر آپ خود ہی گامزن ہیں اور کوئی اس پر قدم نہ بڑھا سکا۔

شبلی اور آزاد نے جب حالی کو تنقید کرتے ہوئے دیکھا تو چپ ہو رہے حالی نے شبلی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا "میں نے آپ کی خدمت انجام دے دی۔

شبلی نے شکریہ ادا کیا۔

(حالی نے تنقید جاری رکھتے ہوئے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا) پابندیوں کی کمی معیار کی قید سے آزاد زبان کے جھگڑوں سے نجات حاصل ہونے کی وجہ سے حضرت نظیر کو اپنی شاعری کو اتنا وسیع کرنے کا موقع ملا۔ نیز اپنے ہندی داں عربی کی زباں نہ جاننے والوں کا خیال مد نظر رکھتے ہوئے واعظانہ اور ناصحانہ نظمیں ایسی دل پذیر لکھی ہیں جیسے حکیم لقمان کی "ایسپس فیبل" انگریزی ادب میں)

نظیر نے اپنے آگے سے کنول کھسکا کر رنگین کی طرف بڑھا دیا۔

[رنگین :- سعادت یار خاں نام ۱۱۷۶ھ میں غالباً پیدا ہوئے ہوں گے اس واسطے کہ ۸۰ برس کی عمر کر کے ۱۲۵۲ھ میں انتقال کیا۔ بموجب تحقیق ناسخ ریختی کے موجد لیکن دیگر تذکرہ نویس رنگین کو انشاء کا پیرو (ریختی میں مانتے ہیں) ان کا مصنفہ ایک تذکرہ ہے۔ " مجالس رنگین وتذکرہ کلام شعراء۔"

مرزا طہماسپ تورانی کے بیٹے خود سرہند میں پیدا ہوئے دہلی میں نشو و نما ہوا سپاہیانہ فنون کے ماہر شہ سواری اور تیر اندازی میں مشہور تمام عمر شہزادوں میں مثل ان کے بسر کی۔ گھوڑے کے تاجر تھے مسافرت میں زیادہ زندگی گذری خانگیوں سے میل جول کی وجہ سے ریختی کا شوق پیدا ہوا ایک پورا دیوان انکا ریختی میں موجود ہے دہلی کی بیگماتی زبان ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے یہ انشاء اللہ خاں کے دستار بدل بھائی تھے ان کے چار دیوان ہیں (۱) دیوان ریختہ (۲) دیوان بیختہ (۳) دیوان آمیختہ (۴) دیوان انگیختہ۔]

آزاد :- (بہ ایمائے ولی) رنگین صاحب! حضرت کا حکم ہے کہ آپ ریختی پڑھیں گے اور ریختی پڑھنے کے اصول کے بموجب آپ کا کلام ایک اہم جزو ہے ہماری زبان کا۔ جس طرح غزل صنف ذکور کی لسانی ارتقا کا آئینہ ہے اسی طرح ریختی صنف اناث کی زبان کی ترقی و تبدیلی کی تصویر۔

(رنگین اپنی کمر کا پٹکہ کھولتے ہیں اس کے۔ چادرے کے نیچے ایک لال دوپٹہ جس کے چاروں طرف لچکا لگا ہوا ہے اور سروں پر پلو دار آنچل کمر میں

پھٹا ہوا تھا اسے کھول کر اوڑھ لیتے ہیں اس طرح کے سوائے رنگین پائجامہ کے اور کوئی حصہ کپڑوں کا نہیں دکھائی دیتا۔ گھونگھٹ نکال کر نئی دلہن کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر پڑھتے ہیں)

ریختی

جو ہونی تھی وہ بات ہولی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

بچھڑ جاؤ نگری سے مرجاؤ سارے
لگے تم کو ایسی ہی گولی کہارو

چلو ہولے ہولے دھمک سے یہ کمبخت
گئی سب مسک میری چولی کہارو

مرے مغز کے بس اُڑاؤ نہ ٹکڑے
سناؤ یہ اپنی نہ بولی کہارو

الٰہی کرے نکلے تالو میں گلٹی
یہ جیسی زباں تم نے کھولی کہارو

جو ہی اُتری ڈولی سے میں توں ہی تم نے
پٹاری مری سب ٹٹولی کہارو

علی کی قسم میں کہاری نہ دوں گی
مجھے سمجھو تم نہ بھولی کہارو

مری ڈولی لے کر دریبہ میں رکھدو
خریدوں گی پانوں کی ڈھولی کہارو

ذرا گھر کو رنگینؔ کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

ان کے ہر ہر شعر پر دونوں بادشاہ بالخصوص اور باقی سب لوگ تعریف کرتے ہیں صرف نظیرؔ، انیس و دبیرؔ، حالیؔ اور محسنؔ خاموش ہیں۔ جان صاحب مارے خوشی کے بے چین ہوئے جاتے ہیں۔ آتشؔ، غالبؔ اور ناسخؔ مسکرا رہے ہیں اور نسوانی محاورات کی بندش اور صفائی کلام پر مسرور ہو رہے ہیں۔

تیسرے اور ساتویں شعر پر رنگینؔ نے جان صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے دوگانہ سنو یہ ہماری دہلی کی بولی ہے۔" جان" اے مری نازنین سلامت رہیے" دونوں ہاتھ بڑھا بڑھا کر بلائیں لیتے ہیں۔ رنگین کے کلام رنگین کے بعد تھوڑی دیر تک ایک ہنگامہ رہا رنگین نے کنول ناسخ کی طرف بڑھایا اور کہا "لو بھیا اب تم پڑھو" یہ کہہ کر رنگین نے لال دوپٹہ سر سے اتار کر پیچھے جو گاؤ تکیہ تھا اس کے نیچے چھپادیا۔

[شیخ امام بخش ناسخ :- شیخ امام بخش نام ناسخ تخلص ۸۰ سال کا سن ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں پیدا ہوئے ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں انتقال کیا محلہ چوک کی ٹکسال کے ایک مکان کے اندر دفن ہیں۔

بڑے تن و توش کے قوی ہیکل سیاہ فام آدمی ہیں سر منڈا ہوا بلند بالا کشادہ سینہ ورزشی پہلوان ہیں۔ اپنی زندگی میں صبح سویرے سے ورزش کرتے تھے دوپہر کو قبل ظہر نہاکر چوبیس گھنٹہ میں ایک بار کھانا کھاتے تھے (تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ غذا کا وزن پانچ سیر ہوتا تھا) فصل کی ترکاریاں فصل بھر میں ایک یا دو بار کھا لیتے تھے بجائے کھانے کے، مثلاً آم، امرود، خربوزہ، پھلیندے وغیرہ۔ تمام عمر مجرد رہے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ نے "ملک الشعرا" کا خطاب دینے کو طلب کیا یہ نہیں گئے کہلا بھیجا" خطاب دینا شہنشاہ دہلی کا منصب ہے میں ایک صوبہ دار کا خطاب لے کر کیا کروں اور دربار میں کیوں جاؤں۔ بادشاہ کو ناگوار ہوا انھوں نے ترک وطن کر کے الہ آباد میں میر اجمل کے دائرے میں سکونت اختیار کرلی غازی الدین حیدر کے

انتقال کے بعد پھر لکھنؤ چلے آئے ان کی پیدائش تو فیض آباد کی تھی مگر بچپن سے لکھنؤ وطن تھا فارسی اور عربی کے درسیات میں فاضل تھے شعر پر کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی انکی تین خصوصیتیں ہیں (۱) قادر الکلامی (۲) طرز جدید (۳) شہرت تلامذہ، ان کا لقب "پہلوان سخن" ہے تلاش الفاظ پر زیادہ متوجہ رہے بدنصیبی سے بعض جگہ ایسے منغلق الفاظ عربی اور فارسی کے داخل ہو گئے کہ غزل کی بساط سے باہر ہیں ان کے کلام میں "حسن ظاہری تو بہت ہے مگر تاثیر کا نام نہیں" یا "کاغذ کے پھول ہیں رنگ تو خوب چوکھا مگر تازگی وخوشبو ندارد۔" انھیں نے تذکیر و تانیث کے سخت قواعد بنائے جن کی پیروی جلال نے کی خاص طور سے ناسخ نے ہندی الفاظ یک قلم اپنے اشعار سے خارج کر دیے۔ تنوع مضامین سے غزل کا دائرہ وسیع کیا۔

ناسخ نے اپنی طرف کنول کھسکایا تو آزاد نے کھڑے ہو کر کہا "بسم اللہ حضرت پہلوان سخن جناب شیخ امام بخش صاحب ناسخ آپ حقیقتہً ناسخ طرز قدیم اور مجدد طرز جدید ہیں۔ حضرت آپ کی قادر الکلامی کے سب معتقد ہیں۔

ناسخ :۔ آپ کے حسن سماعت اور حسن ظن کا شکریہ مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ ع

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

میر صاحب :۔ (متانت کے تبسم کے ساتھ) بسم اللہ کلام کا اشتیاق ہے اظہار عقیدت کا چنداں موقع نہیں۔

ناسخ :۔ عرض کرتا ہوں :۔ مومن، غالب، مصحفی، جلال، رشید سب ہمہ تن

متوجہ ہو جاتے ہیں ۔

غزل

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا

زبسکہ وصفِ دہانِ شیریں، رہا ہے وردِ زبانِ شیریں
بدن میں جبتک ہے جانِ شیریں مزا دہن میں ہو انگبیں کا

وہ چشم فتاں ہے غیرتِ مُل، وہ زلفِ پیچاں ہو رشکِ سنبل
عذار میں ہے شباہتِ گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

یہ جوش پر یاں ہے اشکِ پیہم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم
جسے سمجھتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہ آتشیں کا

زبسکہ ہے جوش داغِ ہجراں ہوا ہے یہ سینہ باغِ رضواں
بجائے گل گشت جائے غلماں خیال آتا ہے اک حسیں کا

یہ ساعدوں کا ہے اسکی عالم کہ جسنے دیکھا ہوا وہ بیدم
بنام تیغِ قضائے مبرم۔ لقب ہے قاتل کی آستیں کا

بُرا ہو کم بخت عاشقی کا، نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
بنا ہے عشق بتاں کا ٹیکا، نشان سجدہ مری جبیں کا

اگر ہو پھاہا پہ سمندر۔ یقیں ہے خاک دم میں جل کر
سنا جو ہو آفتاب محشر، اکھڑ نہ ہے داغ آتشیں کا

طمع ہے انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب تہِ بال سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

مطلع :- سودا، ذوق، جلال، واہ کیا خوب مرصع مطلع ہے۔

شعر (۲) رشید، مومن تعریف کرتے ہیں۔

شعر (۳) سودا تعریف کرتے ہیں ذوق واہ کیا سجا ہوا شعر ہے لزدم مالایلزم کے ساتھ یہ حسن بیان سبحان اللہ!

شعر (۶) میر صاحب تعریف کرتے ہیں غالب اور مومن بھی بے حد تعریف کرتے ہیں۔

باقی اشعار پر جلال، تعشق، برق، رشید بہت تعریف کرتے ہیں۔ جب تعریفوں کا غل ختم ہوتا ہے آزاد کھڑے ہو کر " سبحان اللہ شیخ صاحب کیا اعلیٰ مضامین لزدم کے ساتھ نظم فرمائے ہیں۔ کلام مسجع کو مرصع کرکے کتنا دیدہ زیب بنایا ہے قادر الکلامی اسی کو کہتے ہیں توازن الفاظ اور ترصیع سے لطف موسیقی پیدا کر دیا ہے۔ ناسخ استادانہ طریقہ سے سب کو سلام کرکے کنول نسیم کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔ نسیم تسلیم کرکے ان کے ہاتھ سے کنول لے لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

" استاد! معاف فرمائیے یہ دور مشاعرہ ہے ورنہ میری کیا مجال جو آپ کے بعد زبان کھول سکوں " الامر فوق الادب "

مجمع سے مخاطب ہو کر " حضرات میری کیا مجال جو ایسے کامل استاد فن کے بعد کچھ عرض کروں گا " المامور مجبور " لہذا چاہتا ہوں کہ تعمیل ارشاد حضرت و کی بھی ہو جائے اور استاد کی مرصع و مسجع غزل کے بعد میں غزل کے کوچہ سے بالکل الگ جو میدان ہے اس میں قدم رکھوں (ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں) ہاں پنڈت جی مثنوی کے چند اشعار ارشاد ہوں۔ نسیم دست بستہ

بہت خوب بہت بہتر۔ دگاؤ تکیہ کے پیچھے سے مثنوی اٹھاکر اور آتش کی طرف رُخ کر کے اجازت ہے؟

آتش:۔ (مصحفی کی طرف اشارہ کر کے) حضرت سے اجازت لو میری کیا مجال جو آنجناب کی موجودگی میں اجازت دوں۔

نسیم:۔ (مصحفی کی طرف دیکھ کر) عرض کروں؟

مصحفی:۔ ہاں ہاں بیٹا پڑھو تمہاری مثنوی بھی اردو میں ایک کارنامہ ہے (آتش سے) بھئی حیدر علی تمہارے اس شاگرد نے تمہارا نام روشن کر دیا۔"

آتش:۔ میں کس لائق ہوں! سب آپ ہی کا فیض ہے۔

پورا مجمع سننے کو آمادہ ہے۔ نسیم ایک خاص لہجے میں شروع کرتے ہیں۔

مثنوی نسیم

گل چیں نے وہ پھول جب چرایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد اسے سولی پہ چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورتِ بید — اک ایک سے پوچھنے لگیں بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتہ کا جب نہ پایا — کہنے لگی کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گل چیں کے جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتہ نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سے راست ہو بر اندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا لگا غرض بدلنے

گل رگ سی کف لگی وہ ملنے

در میان خوانندگی نسیم میں ان کے حسن بندش ایراد اش ایجاز محاورہ

کی خوبی صنایع لفظی ایہام تناسب وغیرہ کی تعریفیں ہوتی جاتی ہیں۔

مثنوی ختم کرنے پر حسن (کہتے ہیں) واہ میاں نسیم کیا کہنا ہے زبان کی شستگی

وروانی کیا خوب ہے؟

نسیم: آپ کی مثنوی جو حقیقت میں سحرالبیان نہیں اعجاز ہے اس کے بعد

مثنوی کہنے کی جرأت کرنا بڑی گستاخی اور جسارت ہے اسی واسطے میں نے اپنی

شکستہ کشتی دوسری بحر میں چلائی اور جس قدر ہو سکا اختصار کو کام میں

لایا۔ ورنہ آپ کی اعجاز بیانی کے سامنے میری کج مج زبانی محض ہرزہ سرائی

ہی ہوتی۔

حسن:۔ نہیں بھئی یہ کچھ نہیں ہے حقیقت میں تم نے اختصار اور ایجاز کے جوہر

دکھلا دیئے۔

(نسیم سروقد کھڑے ہو کر حسن کو مؤدبانہ طور سے سلام کرتے ہیں۔)

آزاد:۔ پنڈت جی سبحان اللہ کیا اختصار وایجاز ہے جس کی تعریف ہو ہی نہیں

سکتی۔ پختگی کلام اور تناسب لفظی کی معراج الکمال یہی ہو سکتی ہے۔

نسیم آزاد کا شکریہ ادا کر کے کھڑے ہوتے ہیں اور کنول اٹھا کر اپنے استاد

آتش کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

[نسیم:۔ پنڈت دیا شنکر کول نام۔ نسیم تخلص ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے

۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں انتقال کیا پیدائش بھی لکھنؤ میں ہوئی اور اسی کی خاک میں

مل گئے کشمیری برہمن خاندان کے چشم وچراغ تھے پستہ قد کھلتا رنگ

سیہ چشم چھریرے بدن کے خوب صورت آدمی۔ بڑے ظریف الطبع

بندلہ بنج شاہی فوج کے دکیل شاعری میں آتش کے شاگرد کلام میں تناسب لفظی معنویت اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ عامیانہ انداز سے گریز کرتے تھے۔ برجستگی اور اختصار ان کا طرۂ امتیاز ہے ان کی آورد بھی برجستگی کے سبب سے آمد کا مزہ دے جاتی ہے خصوصاً گلزار نسیم ان کا شاہکار ہے زبان کی سادگی اور پاکیزگی کے ساتھ ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنی ہوئی ہے]

آتش نسیم سے کنول لے کر ذرا سا اپنے بائیں ہاتھ کی طرف کھسکا کر رکھ لیتے ہیں پھر سنبھل کر دوزانو بیٹھتے ہیں اور قرابین پہلو سے اٹھا کر سامنے رکھ لیتے ہیں (اب آتش اس طرح بیٹھے ہیں کہ ان کا رُخ ناسخ کی طرف ہے) نسیم ذرا سا پیچھے کھسک جاتے ہیں آتش و ناسخ قریب قریب سامنے پڑ جاتے ہیں۔

آزاد:۔ (آواز سے) بسم اللہ خواجہ صاحب

خواجہ صاحب ایک خاص بانکپن کے انداز سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر (ناسخ کی طرف روئے عتاب ہے) پڑھتے ہیں۔ (بغیر ترنم)

غزل

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیر دامِ رگِ گل ہے عندلیب — دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو — دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی — رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار — جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

سب شعراء تعریف کرتے ہیں۔ نسیم، شوق، دبیر انیس اور چکبست برابر ہر شعر کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے شعر کی تعریف سودا نے کی۔ چھٹا شعر میر صاحب نے دوبارہ پڑھوایا۔ نویں شعر کو میر مصحفی اور سودا نے بہت پسند کیا۔ چوتھے شعر کی تعریف ناسخ کرتے ہیں۔

[آتش:۔ خواجہ حیدر علی نام آتش تخلص ابن خواجہ علی بخش پیدائش فیض آباد سنہ نامعلوم ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء لکھنؤ میں انتقال کیا (جوڑی شاہ کا تکیہ محلہ نخاس کنگھی والوں میں دفن ہیں) نشان قبر موجود ہے محلہ میر بخارا میں مکان سکونت تھا اس کا پتہ نہیں ایک نہایت بے نیاز و بے پروا فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے کوئی شریف آتا تو متوجہ ہو کر بات کرتے اخلاق سے پیش آتے اگر کوئی دولت مند آجاتا تو دھتکار دیتے یا ملاقات ہی نہ کرتے سپاہیانہ وضع کے ساتھ زندگی بسر کر دی بادشاہ کی سرکار سے ۸۰ روپے ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔ دربار میں جانے سے مستثنیٰ تھے کبھی دربار

ہی قدم نہیں رکھا۔ اسّی روپیوں میں صرف ۱۵ روپیہ گھر میں خرچ کرتے تھے۔ باقی سب فقراء کو راہ خدا میں بانٹ دیتے تھے خود فقر و عسرت سے بسر کرتے تھے۔

سادہ وضع گیروا تہمد باندھتے تھے ایک لمبا سا کرتا موٹے کپڑے کا پہنتے تھے۔ مشاعرہ میں انگرکھا ترچھی گوشیہ ٹوپی کندھوں پر یکتا جالی دار یا شال کا رومال بڑے پائنچے کا پائجامہ۔ کتری ہوئی مونچھیں داڑھی کھچڑی گل مچھے کمر میں سیف ہمیشہ باندھتے تھے کلام میں انھوں نے زبان کی درستی اور صفائی کا کام کیا مرکز لکھنؤ کے دوسرے بانی یہ سمجھے جاتے ہیں۔ محاورات کا بہترین صرف روزمرہ کی بول چال کو بے تکلف نظم کرتے ہیں۔ اردو زبان کے حافظ شیرازی کہاتے ہیں۔ رنگینی و شوخی طبع سے کلام میں دل کشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے، ثقیل الفاظ کلام بھر میں نہ ملیں گے۔

غزل ختم ہونے پر آزاد کھڑے ہوئے۔

آزاد:۔ سبحان اللہ خواجہ صاحب! آپ کی شیریں زبانی اور آتش بیانی نے ایوان شاعری کو خس و خاشاک سے صاف و پاک کر دیا۔ آپ حقیقت میں اردو کے حافظ ہیں آپ کی خصوصیت کلام کے سب معترف ہیں کہ زبان کی صفائی محاورات کا صحیح مصرف اور بول چال کا لطف ہے۔ رنگینی اور شوخی نے کلام میں دل کشی کا جو ہر دوبالا کر دیا ہے۔ کیوں نہ ہو بقول آپ کے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کا مزاج اس غزل کے پڑھنے سے کچھ ایسا برہم ہوگیا ہے کہ وہ آزاد کی تنقید اور تعریف کا کچھ زیادہ خوش مزاجی سے شکریہ بھی نہیں ادا کرتے صرف ان کو معمولی سلام کرکے اپنے آگے کا کنول حکیم مومن خاں کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

آزاد: حکیم صاحب بسم اللہ

مومن

[پیدائش ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۱ء وفات ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۲ء آپ کا حافظہ بہت زبردست تھا۔ طب اپنے والد اور چچا سے پڑھی نجوم میں ایسا کمال تھا اور پیشین گوئیاں ایسی صحیح ہوتی تھیں کہ لوگ ان کی غیب دانی کے قائل تھے، شطرنج میں انکو مہارت کاملہ تھی۔ بہت خوب صورت خوش پوش جامہ زیب آدمی تھے کوٹھے پر سے گر کر انتقال کیا مرنے سے پانچ سال پہلے حکم لگا دیا تھا کہ پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال بعد مر جاؤں گا ۱۸۵۱ء میں کوٹھے پر سے گرے۔ اپنے انتقال کی تاریخ خود ہی کہی۔ "دست و بازو بشکست" ۱۲۶۸ھ گرنے کے پانچویں دن مر گئے۔ شاہ نصیر کے شاگرد تھے]

حکیم مومن خاں مومن۔ اپنے خاص درد انگیز ترنم سے بہت پاٹ دار اور سریلی آواز میں پڑھتے ہیں۔

غزل

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

آج اس بزم میں طوفان اٹھا کے اٹھے
یاں تلک روئے کہ اسکو بھی رُلا کے اٹھے

دل سے کیوں کر نہ دھواں تھا ہوا کے اٹھے
شعلہ ہائے تپ غم سینہ جلا کے اٹھے

گر نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود — درد کیا کیا اثرِ خفتہ جگا کے اٹھے
شمع کے چھوڑ کا محفل میں جو منہ کو دن پھول — دل جرا بیٹھے تھے جو آنکھ چرا کے اٹھے
گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے ایک حرفِ غلط — ایک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے
اف ری گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں — جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے
ہیں دکھاتا نہیں تاثیر مگر ہاتھ مرے — ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دعا کے اٹھے
سوزشِ دل سے ہوا کیا ہی میں پانی پانی — وہ جو پہلو سے پسینہ میں نہا کے اٹھے
جی ہاں مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا — پاؤں کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اٹھے

شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اس کے آگے
خوب احوالِ دلِ زار سنا کے اٹھے

(مومن خاں جب بہت جوش میں پڑھتے ہیں تو ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو انگلیوں میں لپیٹتے اور مروڑتے جاتے ہیں۔ ان کی غزل پر خوب ہر طرف سے تعریفیں ہوئیں۔

عجیب عالم ہے! پڑھنے والے کی آواز پورے مجمع پر چھائی ہوئی ہے اکی ذاتی خصوصیتیں اور خوبیٔ نظم و حسن ادا نے تمام محفل کو بے چین کر دیا ہے۔ ایک عجیب وجدانی کیفیت ہے۔ تمام بزم مشاعرہ بے تاب ہے، فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی اعلیٰ نشست سے سادی سی بات کو بھی پر لطف بنا دیتے ہیں۔ ان کا دل عشق کی لذت سے واقف ہے کلام میں مزا دل کشی۔ تاثیر اجاذبیت ہے تشبیہہ اور استعارے کی ندرت نے آپ کی انفرادیت کو نمایاں کر دیا ہے)

آزاد:۔ (بہت مختصر مائل و دل) حکیم صاحب! سبحان اللہ معنویت کی بلندی

خیالات کی ندرت، لطف ادا، حسن بندش، قادرالکلامی، کہنہ مشقی، کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

مومن خاں سب کو سلام کرتے ہیں اور کنول شیخ ابراہیم ذوق کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

[ذوق:- ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے بچپن میں حافظ مولوی غلام رسول شوق کے مکتب میں بیٹھے حافظ جی سے پڑھنے ہی کے زمانہ میں شاعری کا شوق ہوا ابتدائے شوق میں شوق سے اصلاح لیتے تھے اسی مناسبت سے ذوق تخلص رکھا بعد کو شاہ نصیر سے اصلاح لی، شاہ صاحب سے ان بن ہو جانے پر خود غور کرکے اپنا کلام آپ دیکھنے لگے ولی عہد بہادر (بہادر شاہ ظفر) کے کلام کی اصلاح سے اور اپنی خداداد ذہانت اور علمی دست گاہ سے اپنی قابلیت کا سکہ ایسا جمایا کہ "خاقانیٔ ہند" کا خطاب پایا دربار شہنشاہی سے۔ پھر "خان بہادر" بھی ہو گئے ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی ملا ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ دہلی میں مدفون ہیں موسیقی، رمل، نجوم، طب میں کافی دست گاہ رکھتے ہیں نماز روزے کے سخت پابند عبادت کے بڑے شوقین۔

ان کی غزل میں اختصار کے ساتھ برجستگی اور کسی قدر رنگینی بھی ہے لیکن سب سے زیادہ نمایاں چیز ان کی زبان اور محاورات کی کشش ہے زبان کی صفائی اور لطافت میں مشکل سے کبھی فرق آنے پاتا ہے بلکہ ایسے مزے کے ساتھ الفاظ کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ خود بخود

ترنم پیدا ہو جاتا ہے تصوف کا کافی مزہ ہے ضرب المثل ہو کے نظم کرنے میں خود ضرب المثل ہیں ان کے اشعار صاف اور سادہ ہیں، مجموعی حیثیت سے ان کی غزلیں پُرتاثیر نہیں ہیں، تخئیل میں بلندی زیادہ لیکن کیف بہت کم، اشعار میں مولویت اور قافیہ پیمائی نمایاں مبالغہ کو بلند پردازی کا مترادف سمجھتے ہیں۔]

ذوق کے آگے شمع پہونچی اور آزاد کھڑے ہو کر (دست بستہ عرض کرتے ہیں)

استاد المعظم خاقانیٔ ہند حضرت ذوق حسب الحکم حضرت ولی اللہ اپنا کلام معجز نظام ارشاد فرماتے ہیں۔

ذوق:۔ (ولی کی طرف دیکھ کر) حضرت کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں ورنہ ایسے ایسے خوش گو شعراء کے درمیان میں کچھ بیان کیا عرض کر سکتا ہوں (تمام شعراء سے مخاطب ہو کر) ملاحظہ ہو صاف سی غزل یاد آگئی ہے۔ (بغیر ترنم)

غزل

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے ... اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے ... پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پر ہم جیسے بد قمار ... جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ ... ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
لیلےٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا دود شوق ... سن کر فغان قیس بجائے پری چلے
دنیا کا کس نے راہ فنا میں دیا ہے ساتھ ... تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

مطلع ہی ایسا صاف اور برجستہ ہے کہ سب تعریفیں کرتے ہیں۔

دوسرے و تیسرے شعر پر سب کے ساتھ سودا تعریف کرتے ہیں۔ "بھئی میاں ابراہیم کیا لاجواب دونوں شعر کہے ہیں" (ذوق سلام کرتے ہیں)

چوتھا شعر میر صاحب پسند کرتے ہیں۔

چھٹے شعر پر ولی تعریف کرتے ہیں۔ "بہوت بجا، بہوت اچھے (ذوق کھڑے ہوکر مودبانہ سلام کرتے ہیں)

ذوق:۔ حضرت آپ کی تعریف میرے واسطے دین و دنیا کی نعمت ہے مقطع پڑھ کے

ذوق بیٹھے ہی ہیں کہ آزاد نے شیفتؔہ سے کہا۔

مولانا میری کیا مجال جو کچھ حضرت استاد المعظم کے کلام کے بابت عرض کرسکوں آپ اس فریضہ کو ادا فرمادیں۔" (بیٹھ جاتے ہیں)

شیفتؔہ:۔ (کھڑے ہوکر) حقیقتہً استاد ذوق کا پایہ اتنا بلند ہے کہ میں کیا عرض کر سکتا ہوں چوں کہ استاد نے حضرت سودا کا طرز پسند فرمایا ہے، مناسب یہ ہوگا کہ (سودا کی طرف اشارہ کرکے) حضرت ہی اپنی زبان سے کچھ فرمادیں۔

سودا:۔ (بیٹھے بیٹھے) "میاں ابراہیم تم نے ہمارا قائم کیا ہوا معیار ہمارے بعد برقرار رکھا تنوع مضامین بیان میں زور اظہار علمیت کا خاص طور سے۔ تشبیہہ میں ندرت، الفاظ پر قدرت، دل کشی کا منظر، واقعات کا دفتر فراہم کردیا ہے یہ بھی ایک کمال ہے کہ الفاظ میں ترنم کا خیال ہے اور قصیدے کا پایا تو تم نے ایسا بلند فرمایا کہ ہم کو تمہاری ذات پر فخر ہے یہ بھی ایک ذاتی

امرہے۔

ذوقؔ سوداؔ کو سلام کرکے بیٹھتے ہیں اور کنول نواب مرزا شوقؔ کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

[نواب مرزا شوقؔ:۔ حکیم تصدق حسین المعروف بہ نواب مرزا۔ شوقؔ تخلص غالباً ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے خاندانی پیشہ طبابت کے واسطے ضروری علوم حاصل کرکے طبیب ہونے والے تھے کہ شاعری کا ذوق شہر کے ماحول سے پیدا ہوا۔

آتشؔ کے شاگرد ہوگئے، رنگین مزاجی اور وضعداری نے غزل کے میدان میں خوب جولانیاں دکھائی جو اس وقت کی سوسائٹی کا طرز شاعری تھا اسی میں مشق نے پختگی پیدا کی۔ تقریباً ۲۲ یا ۲۴ سال کی عمر میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا اظہار "مثنوی زہر عشق" میں کیا گیا ہے شوقؔ کی مثنویاں اس وقت ملک کے سامنے پیش ہوئیں جب کہ تمام سوسائٹی قلق کی مثنوی طلسم الفت کی عریاں واقعہ نگاری فضول کی طوالت اور بلا ضرورت مافوق البشر کی اعانت سے متاثر ہو رہا تھا جس میں بیگمات کی زبان اور روزمرہ کے محاورات کا صرف سلیقہ سے نظم ہو جانا لوگوں کو گرویدہ کئے ہوئے تھا کہ لکھنؤ کی فضا شوقؔ کے زمزموں سے گونجنے لگی حسن وعشق کے متوالے صہبائے شوق سے ہوش میں آنے لگے۔ بہار عشق نے دل پر چوٹ کھائے ہوؤں کے زخم جگر پر نمک پاشی کی، زہر عشق نے حسرت ویاس سے بھری ہوئی

موسیقی سے سارے شہر کو دیوانہ بنا دیا۔ عوام کے قلوب مسخر ہو گئے۔ شوق کمال دیکھ کر خواص کی گردنیں جھک گئیں۔"

"شوق اردو کا پہلا مثنوی گو شاعر ہے جس نے اپنے کارنامہ میں مافوق البشر سے کام نہیں لیا ہے۔"

اگلے سخن گویوں کے چراغ اس کے سامنے ٹمٹمانے لگے سچے مضمون کا سچا بیان دلوں پر اپنا نقش جمائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اس تاثیر و دلپذیری کا کلام کو دیکھ کر آخر میں مثنوی کو ممنوع الاشاعت کرا دیا گیا۔

"سب سے بڑا غضب تو یہ ہوا کہ خود شوق کے اخلاص نے نہیں معلوم کس جذبہ کے ماتحت بے چارے شوق کے کل آرٹ کو ایک بالکل فرضی اور سرتاسر غیر فطری واقعہ کی من گڑھت سے مٹانے کی پوری کوشش کر ڈالی (بھلا کہیں زوجۂ منکوحہ گردیں بھی ہوتی ہے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور پھر ایک عمل کے خیر کے واسطے یہ ناجائز روپیہ جو شرعاً عرفاً اور قانوناً بلکہ رسم و رواج ملک و ملت کے خلاف جو ناجائز ذریعہ سے وصول ہو وہ کہیں جائز کام میں صرف ہو سکتا ہے؟) شوق نے کس شوق سے اپنے شاہ کار کو مافوق البشر کی اعانت سے بچایا تھا۔ لیجئے ان کے نواسے صاحب نے ان کے کیریکٹر کردار CHARACTER) کو تہذیب انسانی حدود سے بہت پست کر دکھایا۔ یہ کیوں؟ فقط اس جذبہ میں کہ ہمارے جد بزرگوار نظم کرنے میں مافوق البشر طاقت رکھتے تھے۔ واہ سبحان اللہ کیا کرامت دکھائی ہے نہ اگر کوئی بھی اس واقعہ کو ذرا بھی صدق سے قریب مان

ے تو زہرِ عشق کا کل آرٹ یعنی برجستگی اصلیت و واقعیت کالعدم ہوتی ہے پھر تو یہ مثنوی طلسم ہوشربا کا کوئی میدان یا الف لیلہ کی طرح کی فرضی حکایات بصورت منظوم رہ جائے گی اِدھر مثنوی کی اصلی روح یعنی واقعیت تشریف لے جاتے ہیں (رسم و رواج کے خلاف ایک امر ایسا سرزد ہوا جو عقلاً لائق نفرین ہو یا قوت نظم کی تیمانی کے بارے میں جو روایت گڑھ ہی جائے وہ ایسا سفید جھوٹ جس کا ہونا فقط خلاف عادت ہی نہیں بلکہ خلاف عقل اور اس لئے محال۔ واہ صاحب! کیا اظہار حقیقت فرمایا ہے کہ اس بے چارے کو پورے شاہکار کو پست و بیکار کر دیا۔)

سچ ہے اخلاف کا جوش عقیدت اپنے بزرگواروں کے ساتھ اکثر ایسا طوفان خیز ہوا کہ اسلاف کی شمع شہرت کو بجھا دیا گیا کچھ اولادیں بزرگوں کی نیک نامی کا باعث ہوتی ہیں کچھ باپ دادا کو "بدنام" کرا دیتے ہیں۔

اس غریب شاعر کو فقط بدنام کیا کہیئے بلکہ بدنصیب بھی کہیئے تو اسے صاحب نے یہ من گراہٹ تو کی ہی تھی۔ ایک تھے ان کے بھانجے جو سوء اتفاق سے "حکیم" بھی تھے انھوں نے ماموں جان کی شہرت میں اضافہ کرنے کی غرض سے (گویا بہت نیک نیتی کی) دو مثنویاں اور کہہ ڈالیں ایک "لذت عشق" دوسری "فریب عشق" التزام اسکا کیا کہ وہی بحر ہو اور ویسا ہی ایک واقعہ عشق بوالہوسی کا اختراع کیا مگر "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ان دونوں مثنویوں میں اس زمانہ کی سب سے زیادہ رکیک، ذلیل مذموم، بیہودہ، ناجائز غیر مہذب

یا تیں الفاظ مفہومات ہو سکتے تھے جمع کر کے ایک پہنے سہرے کا بیدین لا مذہب فاسق و فاجر کا کیریکٹر پیش کر دیا کہ ہمارے ماموں جان صاحب مرحوم (خدا بخشے) ایسے تھے۔ بے چارہ نواب مرزا زبان حال سے کہتا ہو گا۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند   شوق از دست خویشتن فریاد

حقیقت میں نواب مرزا کی شہرت کا باعث زہر عشق ہے یہ ایک مختصر عشقیہ مثنوی ہے گو بحر و وزن اور بیان و زبان دونوں کا ایک ہے لیکن درد و اثر میں زہر عشق، بہار عشق سے زیادہ بڑھی چڑھی ہوئی ہے یہ ایک حزنیہ (ٹریجڈی TREGEDY) جس کا انجام ہیروین کا خودکشی کرنا عاشق کے اقدام خودکشی پر ہوتا ہے۔

نواب مرزا شوق کو منظر کشی اور جذبات نگاری کی قدرت خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی اس کا قلم "غفلت کے قہقہوں کو عبرت کے درس" میں بدل دیتا ہے۔ نشاء جوانی میں سرشار بادۂ خودی میں مدہوش بندہ جب اپنی کمزوری اور اپنے پالنے والے کی قدرت کا احساس کرنے لگتا ہے تو غفلتیں دور ہو جاتی ہیں چہرے پر زردی چھا جاتی ہے اس وقت نہ جوانی میں لذت و سرور نہ حسن و رعنائی میں وہ پندار و غرور باقی رہتا ہے بلکہ اس کی جگہ ندامتیں ہیں اور اشکباریاں، عبرتیں ہیں اور آہ و زاریاں لے لیتی ہیں۔

موت کا مہیب چہرہ دکھائی دیتا ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں اور

زبان سے یہی الفاظ خود بخود نکلنے لگتے ہیں۔

جائے عبرت سرائے فانی ہے   مورد مرگ نوجوانی ہے

ہیروئن کی خودکشی کے ارادہ کا وہ منظر جو مشرق کے اس بد نام شاعر" نے کھینچا ہے اپنے اثر اور عبرت انگیزی میں اس کے نقشہ کا مثل و نظیر مغرب کے شہرۂ آفاق ڈراما نویس اپنی تحریری کاوشوں میں عاشق و معشوق کی جدائیوں اور دوامی ملاقاتوں کے متنوع مناظر اور خودکشی یا اقدام خودکشی کے متعدد مختلف مناظر میں پیش نہیں کر سکتا۔

وضع :- وہی جو اس زمانے میں پورے لکھنؤ کے شرفا کی تھی۔ یعنی سر بڑے، منہ پر داڑھی مگر خشخاشی گلوں پر گل مچھے اسی میں بڑی بڑی مونچھیں پیوست عمر تخمیناً ۵۰ - ۵۵ سال سر کے بال ذرا کھچڑی ڈاڑھی مونچھیں خضاب سے خوب سیاہ کھلتا ہوا رنگ گندمی۔ بڑی بڑی آنکھیں دوہرا ورزشی جسم۔

لباس :- سر پہ دو پلی ٹوپی خوب چُنی ہوئی۔ گلے میں چکن کا کرتہ اس پر ڈھاکے کی ململ کا بہت مہین انگرکھا جس کی آستینیں چنی ہوئی اور کنٹھا کڑھا ہوا۔ نارنجی رنگ کے مشروع کا بڑے بڑے پائنچوں کا پائجامہ لال شالباف کا نیفہ]

نواب مرزا :- (آتش سے) اجازت ہے! میری ہمت نہیں پڑتی اتنے بڑے بڑے استادوں کے بعد پڑھنا بڑی جسارت ہے!

(ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں) پڑھیئے پڑھیئے آپ کے کلام کے شوق میں سب

لوگ بیٹھے ہیں۔

حسن :۔ پڑھو میاں یہ دور مشاعرہ ہے "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔"

شوق :۔ ملاحظہ ہو یہ ایک عبرتناک منظر ہے۔

مثنوی

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں — صبر کیوں کر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں تیرے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور

روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی

میرے مرنے کی جب خبر پانا
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا

جمع ہو لیں سب اقربا جس دم
رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم

کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم
ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

ہو گئے تم اگرچہ سودائی
دور پہونچے گی میری رسوائی

طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر
قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر

سامنا ہو ہزار آفت کا
پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں
آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں

میری منت پہ دھیان رکھیئے گا
بند اپنی زبان رکھیئے گا

اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا
ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا

آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے
جگ میں رسوا نہ کیجیئے گا مجھے

ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے
تا کسی شخص پر یہ حال کھلے

ہوتے آفت کے ہیں یہ پر کالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

آ کے رو لینا مری قبر کے پاس
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس

آنسو چپکے سے دو بہا لینا
قبر میری گلے لگا لینا

غنچۂ دل مرا کھلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال
خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال

رنج و راحت جہاں میں توام ہے
کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے

ہم تو اٹھتے ہیں اس جہاں سے کل
اب تو جاتے ہیں اس مکان سے کل

یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں پان کل کے لئے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا کل بسائیں گے قبر کا کونا

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن
اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

یوں تو ہر ہر شعر پر تعریفیں ہوتی ہیں (۱۷) شعر پر تمام اساتذہ نے خاص طور سے تعریف کی بالخصوص دوسرے مصرعہ کے لفظ "یوں" پر

حسنؔ :- یہاں یہ خدا کی دین ہے ایک لفظ "یوں" سے کتنا عمدہ اشارہ ہے کہ مخاطب بہت دیر سے رو رہا تھا اور اس شعر پر اس کا گریہ اور بیقراری کا عالم انتہائے کمال کو پہنچ گیا تھا۔

مصحفیؔ :- فی الحقیقت کیا بات کہی ہے! "الکنایہ افضل من التصریح۔" میاں آتش تمھارے دونوں شاگرد دیرین ہیں۔

آتشؔ :- (دست بستہ) یہ سب آپ ہی کا فیض ہے! میں کس لائق ہوں۔

(اس شعر کے بعد پھر ہر شعر پر تعریفیں ہوتی ہیں۔ زبان کی صفائی محاورات کا سلیقہ کے ساتھ نظم ہونا۔ واقعیت اور اصلیت کا رنگ۔ مثنوی ختم ہونے پر حسن اور نسیم بیحد تعریف کرتے ہیں۔

حسنؔ :- میاں نواب مرزا! سبحان اللہ۔ حقیقت میں تم نے "زہر عشق" میں عشق کا سم قاتل بھر دیا ہے۔ کیا کہنا۔

شوقؔ :- (شاگردانہ طور سے سلام کرتے ہیں)

نسیمؔ :- بھائی شوق صاحب۔ سبحان اللہ کیا زبان ہے! کیا حسن بیان ہے!

کیا پر تاثیر نظم ہے!!!

شوقؔ :۔ (برادرانہ سلام کرتے ہیں)

آزادؔ :۔ خدا کی دین ہے جس کو چاہے عطا کرے۔ بندش کی صفائی، زبان کی سادگی، بول چال کی بے ساختگی، واربست کی واقعیت۔ گویا اصلیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وہیں کے نسوانی محاورات اور طرزِ گفتگو کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

شوقؔ :۔ (سلام کر کے اپنے آگے سے کنول اٹھا کر غالب کے سامنے رکھ دیتے ہیں)

بسم اللہ میں نے بڑی سمع خراشی کی، اب آپ کچھ ارشاد فرمائیے۔

غالبؔ :۔ واہ صاحب! آپ کے اشعار واقعیت اور اصلیت کی عکاسی کر رہے ہیں تاثیر میں بالکل ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا۔ یہ تو در اصل سامعہ نوازی تھی۔ ہر شعر دل کو گداز کئے دیتا ہے۔

شوقؔ :۔ یہ سب آپ کا حسن سماعت ہے۔

اب غالبؔ کے پاس کنول آتا ہے۔

آزادؔ :۔ (کھڑے ہو کر) حضرات نجم درخشندہ فلک شاعری۔ شیر بیشہ سخنوری صرفی جواہر معانی و مطالب جہاں استاد حضرات اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین بزم سخن کی سامعہ نوازی فرماتے ہیں۔

بسم اللہ

[غالبؔ :۔ اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ لقب نجم الدولہ دبیر الملک،

نظام جنگ خطابات۔ پہلے تخلص اسد تھا پھر اسد اللہ کی مناسبت سے غالب ہو گئے۔ پیدائش ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۶ء ۷۲ سال کی عمر کے بعد ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں وفات پائی آزاد نے تاریخ کہی "آہ غالب بمرد"

ان کو فارسی سے ازلی مناسبت تھی ہندوستان کے فارسی شاعروں میں ان کا پایہ بہت بلند ہے انھیں نے ایک ایرانی اہل زبان عبدالصمد سے اکتساب کمال کیا ہے ان کی طبیعت میں ظرافت اور متانت یک جا جمع ہیں خوش اخلاق اور شگفتہ مزاجی نے ان کو مرکز احباب بنا لیا تھا ان کے اردو کلام کے تین دور ہیں (۱) وہ جس میں برائے نام اردو کے الفاظ ہیں (۲) زبان کسی قدر صاف ہے اور فارسی الفاظ کم ہوتے گئے ہیں (۳) جس میں فارسی ترکیبیں کبھی جاتی رہی ہیں۔ یہ بڑے مزے کا کلام ہے۔

غالب نے عام شاعری کی راہ کے متوازی ایک اور راستہ نکالا جس پر خود ہمیشہ چلے اور ان کے بعد پھر زمانہ کو اسی پگڈنڈی پر جانا پڑا بلندی خیال مضامین کی ندرت کو مرزا نے اپنا حصہ کر لیا ہے انھیں نے جدید اور پاکیزہ تشبیہیں۔ علو تخیل۔ معنی آفرینی۔ اور ندرت بندش اپنے واسطے گویا مخصوص کر لی ہے ان کا کلام دماغ پر زور دینے اور ذہنیت کے واسطے درس کا ذریعہ ہے یہ بعض جگہ وہ ایک باتیں ایسی محذوف کر دیتے ہیں کہ جس کو پڑھنے والا خود اپنی طرف سے پورا کر لیتا ہے یہ ذہنی ورزش ایک کیفیت پیدا کرتی ہے درد و غم کی داستان نہایت

موثر اور مختصر انداز میں بیان کرتے ہیں اس طرح گویا میرؔ کا تتبع ہے۔ [ان کی وضع، لباس، شکل و شمائل پہلے بتائی جا چکی ہے۔]

غالبؔ: (میر تقی کی طرف اشارہ کر کے گویا اجازت مانگتے ہیں) عرض کرتا ہوں۔

غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے او ظالم ترے قد کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور رکھ کر کان پر گھر سے قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم

کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہر ہر شعر پر تعریف کا غل مچ رہا ہے۔ مطلع دوبارہ مومن نے پڑھوایا۔ پہلے تیسرے، چوتھے، ساتویں شعر پر تعشق، جلال، داغ، برق، حالی رشید امیر، چکبست، عزیز، فانی، شاد، ثاقب بے حد تعریف کرتے ہیں۔ دوسرا شعر آتش پھر سے پڑھواتے ہیں۔ پانچواں چھٹا شعر ناسخ بے حد پسند کرتے ہیں آٹھویں شعر پر میر بے چین ہو جاتے ہیں ولی تعریف کرتے ہیں۔ سودا، مصحفی، انیس، ذوق سب تعریفیں کرتے ہیں مقطع پر آتش، مصحفی، داغ، ریاض، ظریف اقبال، ثاقب پھڑک جاتے ہیں۔ غزل ختم ہونے پر آٹھواں شعر میر تقی میر پھر سے پڑھواتے ہیں تعریف کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں۔ "میاں اسداللہ تم نے تنگنائے غزل میں جتنا تنوع پیدا کیا ہے وہ کبھی کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا"

غالب مودبانہ سلام کرتے ہیں۔

میر صاحب (پھر غالب کو مخاطب کر کے) مرزا اسداللہ تم ریختہ کے آخری عہد کے استاد ہو فارسی کی لطیف ترکیبوں سے بلاغت کا حق ادا کر دیا تم تجربات قلبی اور واردات زندگی کو ہو بہو بیان کر سکتے ہو تمہارے بیان میں حیات و ممات جبر و اختیار کے مسائل بھرے پڑے ہیں جو ذرا امعان نظر سے سمجھ میں آسکتے

ہیں۔

غالب پھر (تنقید کا) سلام کرتے ہیں۔ بیٹھ کر اپنے آگے کنول انیس کی طرف کھسکا دیتے ہیں۔

انیس نے غالب سے کنول تہذیباً سلام کر کے لے تو لیا لیکن مسکرا کے کہا " یا اسد اللہ غالب! میں تو غزل کے میدان کارزار میں مغلوب ہوں۔" یہ باتیں ہو رہی ہیں کہ :۔

آزاد :۔ (فرحت اللہ بیگ کی طرف دیکھ کر) اشارہ کرتے ہیں مرزا صاحب جناب سید میرزا صاحب تعشق اپنا کلام سنائیں گے۔"

فرحت اللہ بیگ (کھڑے ہو کر) حضرات حسب قرارداد حضرت دلی اللہ یہ طے ہوا ہے کہ ہر سہ مداحین رسول و آل رسول (انیس، دبیر، محسن) بعد ختم دور مشاعرہ اپنا اپنا کلام منبر پر تشریف رکھ کر سنائیں گے۔ لہذا اب جناب سید میرزا صاحب تعشق اپنے کلام سے آپ کو محظوظ فرمائیں گے۔ انیس کے سامنے سے کنول اٹھا کر تعشق کے روبرو رکھ دیتے ہیں۔

[تعشق :۔ سید میرزا نام تعشق تخلص۔ انس شاگرد ناسخ کے دوسرے بیٹے۔ انس کے پانچ بیٹے تھے (۱) عشق (۲) تعشق (۳) صبر (۴) صابر (۵) عاشق، تعشق لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور ہیں ناسخ کے شاگرد مرثیہ اور غزل دونوں کہتے تھے۔ (ان کے بھتیجے اور صابر کے بڑے بیٹے رشید ہیں) غزل میں بہت نام پیدا کیا (اپنے عہد کے شعراء میں لکھنؤ اسکول کے منفرد نمائندے سمجھے جاتے ہیں) جذبات اور

حسن بندش نزاکت خیال اور تاثیر کے لئے مشہور ہیں یہ حقیقۃً ایک فطری
شاعر تھے ان کے کلام میں سوز و گداز و تاثیر بہت ہے اپنے دور کے بہت
بلند مرتبہ شاعروں میں ہیں۔ میر انیسؔ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بھی
برابر ان کی محبت سے فیضیاب رہے۔

۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے ستّر سال کی عمر کرکے ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۲ء میں
میں انتقال کیا۔ میاں عشق کی بقعہ میں مدفون ہیں۔

لباس :- سفید چوگوشیہ ٹوپی قالب پر چڑھی ہوئی۔ ذرا سی کج بائیں
کان کی طرف جھکی ہوئی، ہلکے سیاہی مائل بھورے رنگ کا شانی مخمل کا
انگرکھا جس کے گلے پر بالاتر کے کناروں اور دامنوں پر سفید حریر کا
خوب چوڑا اسنجاف ہے اور آستینوں کے سروں پر بھی ویسا ہی بڑے
بڑے پائنچوں کا سفید پائجامہ۔ ایک شالی رومال تکونا بائیں کندھے
سے پڑا ہوا جس کا ایک سرا داہنے بازو سے اس طرح نکلا ہے کہ
داہنا ہاتھ بالکل کھلا ہوا ہے اور دوسرا سرا بائیں کندھے پر لپیٹ لیا
گیا ہے۔

شکل :- سانولا رنگ۔ سفید خشخاشی گول داڑھی، سفید مونچھیں سفید
وسیع بالوں کے پٹے۔ پیشانی پر بڑھاپے کے شکن پڑے ہیں اور نماز کا
گھٹا نمود دے رہا ہے۔]

تعشق :- (کنول پانے کا سلام کرکے ناسخ سے اجازت لے کر غزل شروع
کرتے ہیں۔ (تحت اللفظ)

غزل

شب کو کیا کیا باغ میں جلوے تمھارے ہوگئے
چاندنی کے پھول جو توڑے ستارے ہوگئے

نوبج مژگاں سے جو بگڑے سب کنارے ہوگئے
قتلِ ناحق دل جگر دونوں ہمارے ہوگئے

دور سے جو آج مدت بعد چار آنکھیں ہوئیں
آبدیدہ ہو کے باہم کچھ اشارے ہوگئے

رات کو تیرا مجھے دھوکا ہوا اے ماہرو
بے خودی میں چاند سے کیا کیا اشارے ہوگئے

بڑھتے بڑھتے آتشِ رخسار لو دینے لگی
رفتہ رفتہ کان کے موتی شرارے ہوگئے

عاشقوں کے شیشۂ دل میں پڑے جاتے ہیں بال
رونگٹوں سے اور بھی رخسار پیارے ہوگئے

حسن کے انشاں بام پر آئے جو تم اے رشکِ ماہ
چاندنی میلی ہوئی بے نور تارے ہوگئے

اس نہ آنے سے تو بہتر ہے کہ آتے وقتِ نزع
کچھ تو حسرت کی نگاہوں سے نظارے ہوگئے

کیا کوئی آتش نفس آج آگیا ہے خواب میں
پھول مرجھائے ہوئے عارض تمھارے ہوگئے

اے تعشق آنسوؤں میں جب ڈبویا عشق نے
تنکے ہمارے آشنا جتنے کنارے ہوگئے

مطلع پر ناسخ، مصحفی، ذوق، امیر، جلال، رشید، شاد، ظریف، ثاقب تعریف کرتے ہیں۔ تیسرے شعر پر میر صاحب۔ مومن، آتش، سرور، تعریف کرتے ہیں۔ یہ شعر دو بار پڑھوایا جاتا ہے آٹھویں شعر پر مومن۔ آتش، غالب تعریف کرتے ہیں۔

نویں شعر پر۔ امیر و داغ بہت تعریف کرتے ہیں۔

باقی اشعار پر کچھ لوگ تعریف کر رہے تھے۔

نقش۔ (غزل ختم کر کے ناسخ اور مصحفی کو مؤدبانہ سلام کرتے ہیں۔)

آزاد:۔ (کھڑے ہو کر) آپ حقیقتہً فطری شاعر ہیں۔ کیا پاکیزہ کلام ہے۔ کیوں نہ ہو آپ مرکز لکھنؤ کے دور آخر کے چشم رو ہیں۔

نقش:۔ نہیں صاحب! میں کس لائق ہوں یہ سب آپ لوگوں کا حسن سماعت ہے۔

آزاد:۔ (کھڑے ہو کر) حضرات آدھا دور مشاعرہ ختم ہوا۔ اب وہ وقت ہے کہ عالم اسباب کے لوگ جو اس مشاعرے کے سامعین ہیں نماز عشا پڑھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لہذا تھوڑی دیر کے واسطے وقفہ دیا جاتا ہے۔ بعد کی نصف ساعت مشاعرہ پھر شروع ہوگا۔

پردہ گر جاتا ہے۔ (انٹرول)

۱۵ منٹ کے انٹرول کے بعد

دوسرا دور

پردہ اٹھتا ہے جوں ہی پردہ اٹھتا ہے کہ فرحت اللہ منجو صاحب آرزو کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے (ہاتھ میں ہاتھ ڈالے) آزاد اور شبلی کے پیچھے سے

محفل مشاعرہ کی طرف لے آتے ہیں اور سب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

فرحت:۔ حضرات لکھنؤ کے سب سے آخری شاعر جانشین جلال سید انور حسین عرف منجھو صاحب آرزو کے یہاں پہونچنے کی خبر ابھی مجکو ملی۔ میں اسی اثنا میں جا کر ان کو یہاں لے آیا۔

(سب لوگوں نے کہا) خوش آمدید

آرزو نے سب کو سلام کیا جلال کو بہت ادب سے خصوصاً سلام کہا۔

مولانا شبلی نے صفی کے پہلو میں ان کو بھی بٹھالیا۔

آرزو ولادت لکھنؤ سنہ ۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ وفات کراچی سنہ ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء

والد کا نام سید ذاکر حسین تھا وہ بھی ایک خوش گو شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ آرزو کا تعلیمی سلسلہ پانچ سال کی عمر سے شروع ہوا۔ درسیات لکھنؤ کے علماء سے پڑھیں۔ فن شاعری اور علم عروض میں جلال سے تلمذ حاصل کیا۔ جلال ناسخ کے شاگرد تھے۔ آرزو کی شاعری ناسخ کی تیار کی ہوئی شاہراہ کے مطابق ہے عرصہ تک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نے کفالت کی جب اسے پیشہ نہ بنا سکے تو مجبوراً تھیٹر کی طرف توجہ کی۔ کلکتہ سے واپس آکر پھر لکھنؤ میں عروس سخن کو آراستہ کرتے رہے۔ تقریباً سنہ ۱۹۴۳ء میں پھر کلکتہ کے نیو تھیٹر میں بلائے گئے جب جاپانی ہوائی جہازوں نے کلکتہ کو آماجگاہ بنایا تو وہ اسی کی کمپنی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں کراچی ایک مشاعرے کی شرکت کے لئے گئے احباب کے اصرار پر کچھ دنوں وہیں قیام کیا ۱۹۵۱ء میں

حرکت قلب کے بند ہونے سے انتقال کیا۔

تبصرہ :۔ میدان سخن کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی مگر مرثیہ، غزل اور گیت آپ کی خاص چیزیں ہیں۔ آرزو صاحب طرز تھے اور صاحب دواوین جیسے فغاں آرزو وغیرہ ان کے کلام میں واصلیت کے اجزا بھی موجود ہیں۔

ان کے اشعار کی خصوصیت، پختگی، شوخی، سلاست زبان کی شیرینی محاورات اور ضرب الامثال تناسب خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ جدید خیالات کو بڑی خوبی سے اپنایا گویا نئی شراب پرانی بوتلوں میں بھری ہے۔

"خالص اردو" آپ کی خاص ایجاد ہے اس میں آپ کی غزلیں شیریں، دل آویز اور موسیقیت سے پُر ہیں۔ موت سے کچھ دن پہلے غزل کے لئے کچھ نئی بحریں تجویز کی تھیں اور تجربتہً غزل کہنا شروع کی۔ افسوس ہے کہ یہ کلام ابتک غیر مطبوعہ ہے۔]

[محفل مشاعرہ اسی صورت سے سجی ہوئی ہے جو جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا ہے مگر اتنا ہوا کہ اکثر لوگوں نے صرف زانو بدل لیا ہے لیکن اپنی ہی جگہ پر قائم ہیں صرف فرق اتنا ہے کہ اب کنول میر یار علی جان صاحب کے سامنے رکھا ہوا ہے (اب کنول جان صاحب کی طرف سے اوپر کی طرف بڑھے گا۔

[جان صاحب ۔ تاریخ ادب اردو مترجمہ عسکری صاحب صفحہ ۱۳۲

میر یار علی المتخلص بہ جانؔ، میر آمن کے بیٹے اور نواب عاشور علیخاں صاحب کے شاگرد وطن اصل لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں زیادہ تر بسبب ملازمت رامپور میں رہے تمام عمر اسی خاص صنف (ریختی) میں بسر کی، اپنی خاص روش پر خوب کہتے ہیں مشاعروں میں زنانہ لباس پہنکر شریک ہوتے تھے اور بالکل عورتوں کی طرح سے پڑھتے تھے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے.

1243ھ / 1827ء میں پیدا ہوئے اور ستر سال کی عمر میں 1312ھ / 1897ء میں انتقال کیا۔]

نہایت ناز و انداز سے سر پر اپنے دوپٹے کا آنچل ڈالے ہوئے بالکل نئی دلہن کی طرح گھونگھٹ نکالے بیٹھے ہیں۔

آزادؔ:۔ (کھڑے ہو کر) حضرات اب دوسرا دور مشاعرہ کا شروع ہوتا ہے یہ دَور چودھویں صدی ہجری کے شعراء کا ہے اس دور کی ابتدا جناب میر یار علی صاحب جانؔ سے ہوگی بسم اللہ جانؔ صاحب۔

جانؔ:۔ اے اوئی (ناک پر انگلی رکھ کر) پہلے میں ہی پڑھوں۔ ہے"

رنگینؔ:۔ اے دوگانہ پڑھتی کیوں نہیں مری جان! پہلے دور میں ہم نے پڑھا اب تم پڑھو۔

جانؔ:۔ اچھا بوا! "جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں کا کیا ڈر"

(نہایت ناز و انداز سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر اور ذرا اٹھلا اٹھلا کر)

ریختی جان صاحب (نہایت مترنم لہجہ میں)

پڑی ہیں سر میں جوئیں اب ایسی کہ زچ ہے جینے سے دل ہمارا
سمانی آماں میں سر میں ڈالوں منگا دو پیسہ کا مجکو پارا

کبھی نہ بھولوں کبھی آکے پوچھا کہ میرے جیوڑے کا حال کیا ہے
یہی تھے اقرار تو نے جس دم کنوار چھلی تھا مرا اُتارا

طمانچے کھائے ہیں میں نے ناحق بلا کے خانم کو گھر میں اپنے
مجھے تو آماں نے پھول کی بھی چھڑی سے اب تک نہیں تھا مارا

مجھے میں دیتی ہوں لاڈو خانم قسم خدا کی یہ دیکھ لینا
نکال لوں گی یہ دونوں دیدے کیا کسی سے جو اب اشارا

گئے ہیں فاقے نگوڑے اتنے کہ جان تن میں نہیں ہے باقی
نیا ہوں تجھ سے بھلا میں کیونکر نہوئے روٹی کا جب سہارا

زمیں پہ کس طرح پاؤں رکھے دماغ اسکا ہے آسماں پر
گئی ہے پیا ہی وہ چاند نہاں سے نہ چکے مہرن کا کیوں ستارا

میں پاس بیٹھی تھی دولھا بھیا کے گردہ سنتے تو ہوتی آفت
کیا غضب کیا یہ تم نے مرزا جو نام لے کر مرا پکارا

رہوں گی میکے میں اپنے جا کر سواری منگوا دو مجکو صاحب
یہ ساس نندوں کی بولی ٹھولی کروں میں کبتک بھلا گوارا

لگی ہوئی ہو بناؤ میں تم دوگانہ چنیا یہ کیا غضب ہے
سواری دولھا کی آکے اُتری دُلہن کو ابتک نہیں سنوارا

تری جو جورو ہے سہرے جلوے کی اسی پہ جا کر یہ فرق دکھلا
ملیں گے جا کر اسی سے ہم تو جسے کہ چاہے گا دل ہمارا
بڑی خوشی سے وہ چھوٹی بیٹی کا اپنی تم سے بیاہ کرتیں
قسم ہے اس سر کی جان صاحب نہ آیا بیگم کو استخارہ

ان کی زبان دانی اور محاورات نسوانی کے با محل نظم پر اختر اور ظفر اور رنگین خصوصاً لوٹے جاتے ہیں، باقی حضرات یعنی نسیم، آتش، شوق، امیر داغ، برق، چکبست، ظریف بہت تعریف کرتے ہیں۔

جان صاحب سب تعریف کرنے والوں کو سلام کر کے ختم ریختی کے بعد بڑے ناز و انداز سے کھڑے ہو کر دلی کو تسلیم بجا لاتے ہیں کہ۔

رنگین :- (پکارتے ہیں) اے دوگانہ مری جان ادھر آ تری بلائیں لے لوں۔
گھر چلے گی تو تجھ پر سے سوکھی مرچ چونے کے ٹیکے دے کر اتار دوں گی۔

جان :- ارے بجیا جیناں میں نے کیا عجوبہ بات کی ہے جو تم کو نظر کا دسواس ہے (کنول اٹھا کر امیر کی طرف کھسکا کر) لو اب امیر بھیا کی غزل سنو۔

امیر :- سلام کر کے باجی بھلا میں آپ کے بعد کیا پڑھوں؟

جان :- لو بھیا مجھ موئی جاہل کو کیا آتا ہے۔ تم ماشاء اللہ مولوی آدمی پڑھے لکھے عالم فاضل تمہاری غزل کا کیا کہنا۔ میرے سر کی قسم پڑھو۔

امیر مینائی: (آتش کی طرف دیکھ کر) اجازت ہے استاد؟*

---

* "استاد" اس واسطے کہتے ہیں کہ امیر مینائی نواب مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے جو خود استاد کہلاتے ہیں اور اسیر مرحوم خود آتش کے شاگرد تھے اس طرح آتش امیر کے استاد کے استاد ہوئے۔

آتش :- بسم اللہ! پڑھیئے مولانا! آپ تو لکھنؤ کے دور آخر کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ بسم اللہ۔

[منشی امیر احمد مینائی۔ امیر تخلص سنہ ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں ۷۳ سال کی عمر کی آخر سنہ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا عربی و فارسی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقویٰ۔ صوفی مشرب۔ طب۔ جفر۔ نجوم۔ میں ماہر وضعداری میں مشہور۔ نواب مظفر علی خان اسیر مرحوم کے شاگرد "فخر استاد" کہلاتے ہیں (انیس و دبیر کے ہم عصر آخری زمانہ میں) واجد علی کے دربار کے متوسل بعد غدر دربار رامپور میں نواب کلب علی خاں کی ۲۳ سال ملازمت کی آخر سنہ ۱۸۸۱ء میں حیدر آباد گئے وہاں سنہ ۱۹۰۰ء میں پیوند زمیں ہوئے۔

ان کی زبان میں ان کے زمانہ لکھنؤ کی سچی جھلک نمایاں ہے۔ علاوہ اور تصنیفات کے دو دیوان (۱) مراۃ الغیب۔ سنہ ۱۲۵ھ میں اور (۲) صنم خانہ عشق سنہ ۱۳۱۳ھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کتاب "سرمۂ بصیرت" ہے (جس میں فارسی و عربی کے وہ الفاظ جمع کئے جو اردو میں غلط مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں) سب سے اہم مزین تصنیف "امیر اللغات" ہے۔

آپ کا ابتدائی کلام کچھ استاد ناسخ کے رنگ کا ہے لیکن کہیں ناسخ کی سی "خشک شاعری" نہیں ہے اور اتنی بے کیفی بھی نہیں ہے بلکہ

فصاحت اور ترنم ہر ہر شعر سے ظاہر ہے۔ اس میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سونے میں سہاگے کا کام کر رہی ہے۔ (صوفیانہ ترنم سے پڑھتے ہیں)

غزل

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے
تند مے اور ایسے کمسن کے لئے ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے
حور ہے یارب جو مومن کے لئے بھیجدے دنیا میں دو دن کے لئے
وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا ہم برے سب سے ہوئے جن کے لئے
پی بھی لے زاہد جوانی میں شراب عمر بھر ترسے گا اس دن کے لئے
کون ویرانی میں دیکھے گا بہار پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر! دن گنے جاتے ہیں جس دن کے لئے
باغباں کلیاں ہو ہلکے رنگ کی بھیجنا ہے ایک کمسن کے لئے

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیرؔ
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

(مطلع پر سب تعریف کرتے ہیں۔ میر صاحب۔ "بہت صاف زبان ہے" امیر سلام کرتے ہیں دوسرا شعر آتش بہت پسند کرتے ہیں۔ تیسرے شعر پر مومن بہت تعریف کرتے ہیں (میاں! میرا بھی حصہ چھینے لیتے ہو۔ چوتھے شعر پر غالب تعریف کرتے ہیں۔ پانچویں شعر پر داغ، غالب، ریاض سب تعریف کرتے ہیں۔ چھٹے شعر پر آتش، ناسخ، ثاقب۔ ساتویں شعر پر میر صاحب، مصحفی

رشید، آٹھویں شعر پر داغ، ثاقب۔ دسویں شعر پہ سب تعریف کرتے ہیں اور دوبارہ پڑھوایا جاتا ہے۔ مقطع پر آتش، حکمت، نسیم، برق، رشید سب تعریف کرتے ہیں)

آزاد:۔ (کھڑے ہوکر) سبحان اللہ حضرت آپ نے لکھنؤ کی معیاری زبان اور لطف تغزل کا نمونہ دکھا دیا۔ کیا ترنم کے ساتھ ساتھ فصاحت اور عذوبت ہے۔ بے شک یہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔

(امیر اپنے آگے کا کنول داغ کی طرف بڑھاتے ہیں داغ سلام کر کے ان کے آگے سے کنول لے کر اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں)

آزاد:۔ بسم اللہ حضرت نواب مرزا خاں صاحب داغ

داغ:۔ (ذوق کے چشم و ابرو کی طرف دیکھ کر) اجازت ہے استاد

ذوق:۔ بسم اللہ! پڑھو!

داغ:۔ (نہایت مترنم لہجہ میں اور خوش آیند ترنم کے ساتھ) ملاحظہ ہو۔

غزل

پوچھتا جا مرے مرقد سے گزرنے والے
کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے

دیکھتا جا ادھر ادھر سے ڈرنے والے
نیچی نظریں کئے محشر میں گزرنے والے

یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا
او فسوں ساز دغا باز مکرنے والے

آپ محشر میں ہنسیں قول کے سچے کیا خوب
انگلیاں اٹھیں کی وہ آئے مکرنے والے

گالیاں غیر کو دیتا ہوں سنو تم خاموش
میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے

ایک تو حسن بلا اس پہ بناوٹ آفت
گھر بگاڑیں گے ہزاروں کا سنورنے والے

قتل ہوں گے ترے ہاتھوں سے خوشی ہو اسکی — آج اترائے ہوئے پھرتے ہیں مرنے والے

حشر میں لطف ہو جب ان سے ہوں دو دو باتیں — وہ کہیں کون ہو تم ؟ ہم کہیں مرنے والے

خوش نوائی نے کیا ہم کو اسیر صیاد — ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

داغ کہتے ہیں جنھیں دیکھئے وہ بیٹھے ہیں

آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

مطلع تو زبان زد خلائق تھا ہی سب نے تعریف کی۔

دوسرے شعر پر امیر، جراءت۔ ذوق، سرور، حکمت تعریف کرتے ہیں۔
تیسرا شعر آتش پسند کرتے ہیں۔ نسیم، رشید، تعشق تعریف میں شریک ہیں۔

چوتھے شعر پر " انگلیاں اٹھیں گی " کہہ کر جراءت تعریف کرتے ہیں۔
پانچواں شعر۔ ذوق " ماشاء اللہ خوب ایراد المثل ہے " جراءت کو پسند آتا ہے
چھٹا شعر۔ جراءت بہت خوب ہے کیا بے تکلف مصرعہ ہے۔

ساتواں اور آٹھواں شعر آتش پسند کرتے ہیں۔
نویں شعر پر جراءت، مومن، آتش، تعشق، امیر سے کر ناتب تک تعریف کرتے ہیں۔

دسویں شعر پر وہی حالت ہوئی جو مطلع پر ہوئی تھی، دوسرا مصرعہ سبکو یاد تھا بالخصوص مومن نے بہت پسند کیا۔
داغ سب کو سلام کر کے کنول جلال کی طرف بڑھاتے ہیں جلال سلام کر کے کنول ان کے ہاتھ سے لے لیتے ہیں۔

آزاد: سبحان اللہ بھائی نواب مرزا صاحب کیا کہنا ہے زبان کی صفائی اور

روانی کلام میں چلبلاپن اور شوخی ایسی کہ عوام تک جس سے اٹھا سکیں

معاملہ پسندی شباب و سرمستی کی بے مثل تصویریں آپ نے استاد جرأت

کا تتبع کیا ہے۔

[داغ: ۔ نواب شمس الدین خاں کے بیٹے نواب مرزا خاں نام، داغ

تخلص ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۶۔ ۷ برس کی عمر میں رجب

ان کی بیوہ والدہ نے مرزا فخرو سے شادی کر لی تو (لال قلعہ) قلعہ معلیٰ

میں ماں کے ساتھ رہنے لگے شاہزادگان قلعہ معلیٰ کے ساتھ تربیت و تعلیم

ہونے لگی استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے بعد غدر رام پور میں رہنے

لگے وہاں سے حیدرآباد چلے گئے تو وہیں کا پیوند ہو گئے۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء۔

چار دیوان چھوڑے۔ گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ

یادگار داغ۔

کلام: ۔ صفائی و روانی زبان۔ ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے احتراز

پیچیدہ استعارے اور بعید از عقل تشبیہات استعمال نہیں کرتے چلبلاپن

اور شوخی کلام کی جان ہے جو اکثر حد سے بڑھ کر سنجیدگی سے

گر جاتی ہے باہر نکل جاتی ہے یہ "ارباب نشاط" کے شاعر کہلاتے

ہیں مگر ہزاروں شعر ایسے بھی ہیں جن میں خیالات نہایت پاک و

صاف بلند اور متین موجود ہیں لیکن اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ ان

کا کلام اصلیت اور متانت سے بہت بعید ہے علم النفس سے انکو بالکل

لگاؤ نہ تھا۔ ان کے حسن و عشق میں عصمت سچائی اور حسن حقیقی کی جلوہ گری نہیں ہے ان کا معشوق اکثر و بیشتر ایک "لعبت بازار" ہے جسکی محبت مثل دیگر بازاری چیزوں کے خریدی جا سکتی ہے زیادہ تر اشعار صرف بزم قدح خواران اور "ارباب نشاط" کے جمگھٹوں میں گائے جانے کے لائق ہیں نہ کہ مہذب صحبت میں ادبی ذوق کی تشنگی بجھانے کے کام میں آسکیں۔

وضع شکل لباس۔ ۷۰ سال کی عمر سیاہ فام بڑے قد و قامت دوہرے ڈیل ڈول کے آدمی، چوڑی گھنی خضاب کی ہوئی ڈاڑھی جس کو کنگھی کرکے ٹھوڑی کے دونوں طرف چڑھائے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی گھنی مونچھیں اوپر کی طرف مڑور کر چڑھی ہوئی ہیں، حیدرآبادی درباری پگڑی (مثل ڈھول کے) فیروزی مخملی اچکن جس کے گلے سینے اور آستینوں کے کناروں پر قیتون کا کار چوبی کام کمر میں چاندی کے بکلس کی داب سفید اوسط کی مہری کا پائجامہ پہنے ہیں۔

امیر و داغ کا موازنہ و مقابلہ

(۱) داغ کے کلام سے جس طرح شاعر محظوظ ہوتے ہیں اسی طرح عوام بھی حظ اٹھاتے ہیں مگر جو قوت ممیزہ سے کام لیتے ہیں ان کو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار، پسند نہیں آتے۔ ان کو امیر کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے جس میں متانت تہذیب و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ بلندیٔ خیال بھی ہے اور سلاست زبان بھی

(۲) داغ بڑے زندہ دل رند مشرب ہیں۔ امیر مولوی تقدس مآب ہیں۔

(۳) منشی امیر احمد کی اوائل عمر کا کلام ناسخ کے رنگ میں ہے۔ نواب مرزا خاں کی اوائل عمر گو دہلی میں گذری مگر ان کا کلام جرأت کے رنگ میں ہے لیکن آتش کی صفائی بندش و سلاست زبان کو اپنی دہلوی روش میں خوب سمویا ہے۔

(۴) داغ کے اشعار کا خارجی حصہ بہت اچھا ہے اور باطنی (داخلی) حصہ بہت ہلکی اور چھورا ہے اس کے برخلاف امیر کا کلام (داخلی اور خارجی) ظاہری اور باطنی پہلوسے یکساں اور ایک پایہ رکھتا ہے۔

(۵) باعتبار شکوہ الفاظ متانت و نازک خیالی امیر کو داغ پر ترجیح ہے کیونکہ عروض و ضروریات شعری کے اعتبار سے امیر بہت بڑے استاد ہیں۔ ان کے کلام میں اس قسم کے سقم شاذ و نادر ہی ملیں گے۔

جلال نے (ناسخ کے چشم و ابرو پر نظر ڈال کر کہا) عرض کرتا ہوں۔

ناسخ:- حکیم صاحب بسم اللہ آپ تو میری کوششوں کے متمم ہیں۔

(جلال تحت اللفظ لیکن بہت صاف آواز میں۔ پڑھتے ہیں)

غزل

نکل کے تا بہ لب آہ رسا نہیں آتی
کراہتا ہے جو دل اب صدا نہیں آتی

ہماری خاک کی مٹی ہو کیا خراب اے چرخ
کبھی ادھر کو ادھر کی ہوا نہیں آتی

عدو ہماری عیادت کو لیکے آئے انھیں
کہاں یہ مر رہے اب بھی قضا نہیں آتی

ابھار دیتی ہے اس کی جفا کو میری وفا
غرض کہ نوبت ترک جفا نہیں آتی

لحد پہ آئے تھے دو پھول بھی چڑھا جاتے
ابھی تک آپ ہیں بولے دعا نہیں آتی

بتوں کو دیکھ ہماری نگاہ سے اے شیخ
نظر ان آنکھوں کو شان خدا نہیں آتی

مری لحد کو وہ ان کا یہ کہہ کے ٹھکرانا
صدائے نعرۂ صد مرحبا نہیں آتی

نگاہ ناز کے کشتے پڑے سسکتے ہیں
ادا کے مارے ہوؤں کو قضا نہیں آتی

ستم ہے اور مرے دل شکن کا یہ کہنا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں آتی

تلاشِ جلوہ گہِ دوست کو چلی ہے نگاہ
پلٹ کے دیکھیے آتی ہے یا نہیں آتی

جلالؔ ہم یہ نہ مانیں گے تو اسے نہیں یاد
تجھے کبھی کوئی ہچکی بھی کیا نہیں آتی

مطلع کی تعریف ناسخ کرتے ہیں اور جلالؔ کے تمام ہم عصر، تیسرے شعر کی تعریف غالبؔ کرتے ہیں۔ اور مومنؔ خاں کو ترکیب بہت پسند ہے وہ اس طرز بندش کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ امیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ تعریف کر رہے ہیں، پانچویں شعر کی بندش کی تعریف بہت ہوئی۔ امیرؔ، تعشقؔ، شادؔ، ریاضؔ تعریف کرتے ہیں۔ آٹھواں شعر جرأتؔ کو بہت پسند آتا ہے۔ نویں، دسویں شعر کی تعریف میں سب کے ساتھ ناسخؔ بھی شریک ہیں۔ دسواں شعر غالبؔ، مومنؔ، دردؔ بہت پسند کرتے ہیں اور دوبارہ پڑھوایا جاتا ہے۔ مقطع پر سب مل کر تعریف کرتے ہیں۔

جلالؔ سلام کے کنول اپنے آگے کا کھسکا کر سرورؔ کی طرف بڑھا رہا ہیں کہ

آزادؔ :۔ (کھڑے ہو کر) واہ حکیم صاحب! آپ نے حقیقت میں استاد ناسخؔ کے طرز کی نہ صرف تجدید کی اور تکمیل کو پہنچا دیا بلکہ زبان کے چمن کو اغلاط کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کر دیا۔ آپ اپنے عہد کے پیغمبر زبان ہیں۔ جلالؔ سلام کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

[جلالؔ :۔ حکیم سید ضامن علی جلالؔ تخلص $\frac{۱۲۵۳ھ}{۱۸۳۷ء}$ لکھنؤ میں پیدا ہوئے حکیم اصغر علی کے بیٹے۔ فارسی عربی کی تکمیل کر کے طب پڑھی اس کے بعد

شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ رشک شاگرد ناسخ سے اصلاح لی۔ ان کے ہم عصروں میں قلق، بحر، رشید، امیر وغیرہ بھی تھے۔ غدر کے بعد رامپور پھر منگرول گئے لیکن واپس آگرے، ۷۷ سال کی عمر میں پھر ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء لکھنؤ ہی میں پیوند زمین ہوئے۔

رنگ ناسخ کے حامی، خارجی عناصر اور رنگینی بیان پر زیادہ زور دیتے ہیں علو تخیل اور پرجوش انداز کم ہے۔ اشعار زبان و محاورات و قواعد عروض و صرف و نحو کے لحاظ سے بہت صحیح ہیں ان کا تمام کلام اغلاط سے پاک و صاف ہے اور بطور سند پیش کیا جاتا ہے انھوں نے بہت سے قابل ترک الفاظ کو ترک کر دیا اور اچھی اچھی اصلاحیں زبان و استعمال الفاظ میں کیں۔ جلال نے اکثر بحر کی بھی تقلید کی ہے انکی علمی استعداد کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہو سکتا ہے۔ دیوان اول "شاہد شوخ طبع"، دیوان دوم "کرشمہ پاک سخن" دیوان سوم "مضمون ہائے دل کش" دیوان چہارم "نظم رنگین" (۵) "سرمایہ زبان اردو" (۶) "افادہ تاریخ" فن تاریخ گوئی میں) (۷) منتخب القواعد (۸) تنقیح اللغات (۹) لغت گلشن فیض (۱۰) مفید الفصحا (۱۱) رسالہ علم عروض (۱۲) رسالہ تذکیر و تانیث۔

شکل و شمائل:۔ کشادہ پیشانی، چپٹا چہرہ، کشادہ دہانہ، خوب بھری بھری خشخاشی سفید داڑھی۔ لمبی مونچھیں کھچڑی بٹے جو کانوں سے ذرا نیچے ہیں سر پر مخملی ٹوپی، دھاری دار الپاکے کی اچکن جس میں کمر توڑ لگی ہے۔

آستینیں ذرا ذرا ہاتھ سے بڑھی ہوئی انگلیوں تک پہونچتی ہوئی۔ ایک ہاتھ
میں رومال دوسرے ہاتھ میں جریب سفید بڑی مہری کا پائجامہ نخلی
پمپ۔]

سرورؔ جہان آبادی :۔ منشی درگا سہائے نام، سرورؔ تخلص۔ حکیم
پیارے لال کے بیٹے۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے دسمبر
۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء جہان آباد تحصیل اسکول سے اُردو مڈل پاس کیا مولوی سید
کرامت حسین صاحب بہار سے فارسی کی تکمیل کی۔ اردو شاعری میں بھی
ان سے اصلاح لی۔ مشقِ سخن کے دوران میں انگریزی مڈل کا امتحان
(پرائیوٹ) دے کر پاس کیا۔ اپنے ہی قصبہ میں علاج و معالجہ سے
بسر اوقات کرنے لگے۔ نہایت راست باز۔ منکسر مزاج، عالی ہمت آدمی
تھے۔ تھوڑی سی زمینداری اور طبابت اور کبھی کبھی ملازمت اتالیقی
اور کبھی ملازمت دفتر رسالہ "زمانہ" کانپور ذریعہ معاش تھا۔ عسرت
سے زندگی گذارتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر عمدہ عمدہ نظمیں بضرورت
فروخت کرکے دوسروں کے نام کردیں ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء انتقال۔

" یہ ایک نیچرل شاعر ہیں۔ ان کی تشبیہیں بہت دل کش سمجھی جاتی ہیں
بیان میں رنگینی بھی ہے سوز و گداز بھی اگر بعض لفظی اور فنی اغلاط ہوں
بھی تو اس سے پورا کلام متاثر نہیں ہو سکتا۔" (اعجاز حسین)

شکل و لباس :۔ لمبا چہرہ، فکر مند بشرہ، آنکھیں گو چھوٹی مگر روشن۔ گھنے
ابرو۔ سر پہ انگریزی بال، آڑی مانگ۔ کچھ بال سیاہ فلٹ کیپ سے

ماتھے کے اوپر نکلے رہ گئے ہیں یا یہ سمجھئے کہ ٹوپی کو ذرا ہٹا کر پہنا ہے
ڈاڑھی منڈی ہے مونچھیں خوب گھنی گھنی سیاہ بڑی بڑی ہیں۔ چند
کالر کا پارسی کوٹ پہنے ہیں۔ تین بٹن اوپر کے کھلے ہوئے ہیں کہ سفید
قمیص دکھلائی دیتا ہے۔

سرور:۔ (جب کنول ان کے سامنے آیا) حضرات! میں ایسے لائق لوگوں اور اساتذہ کے درمیان میں کیا پڑھ سکتا ہوں بلکہ مجکو اپنا ناچیز کلام سناتے شرم آنا چاہیئے۔

جلالؔ:۔ سرور صاحب! ضرور کچھ پڑھیئے آپ نے بھی بڑی خدمت نظم اردو کی ہے انگریزی نظموں کا ترجموں کر کے بہت کچھ تخئیل شاعری میں اضافہ کیا ہے مناظرت قدرت کو ندرت تشبیہہ کے ساتھ نظم کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

سرور:۔ (جلالؔ سے) حکیم صاحب! معاف کیجئے گا۔ آپ کے بعد پڑھنا گستاخی ہے۔

حکیم جلالؔ:۔ جی نہیں! اس گستاخی کا خیال ہی نہ کیجئے یہ دور مشاعرہ ہے جو جہاں بیٹھا ہے اپنے نمبر پر پڑھے گا۔

سرور:۔ (سنبھل کر بیٹھتے ہیں) اس نظم کا عنوان ہے۔

"بیر بہوٹی"

ظریفؔ:۔ واہ سرور صاحب! بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ دیکھنے سے آنکھوں کو سرور نظم سننے سے کانوں کو سرور۔

سرور:۔ (مسکرا کر اور سلام کر کے) ملاحظہ ہو۔ (مترنم لہجہ میں)

آہ او ننھے سے کیڑے نازش صحرا ہے تو ۔۔۔ دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گل رعنا ہے تو
صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو ۔۔۔ شعلہ زار حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو

برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یا قوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا
قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

حالی و اقبال "قطرہ مضطر" کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ باقی سب دیگر شعراء برق، چکبست، حالی، ریاض، عزیز خوب تعریف کرتے ہیں۔

حالی:۔ یہ بالکل نادر تشبیہ ہے۔

گل بداماں ہے کوئی دوشیزۂ کمسن مگر
ہلکی پھلکی سرخ پھولوں کی ہے چادر دوش پر
وقفِ رعنائی ہے کیا کوئی عروسِ سیم بر
روئے زیبا پہ ہے غازہ سرخ جوڑا زیب بر
لوٹتا ہے کوئی بسمل سبزۂ بیگانہ پر
یا مئے گلگوں کا قطرہ ہے لبِ پیمانہ پر

حالی اور اقبال بہت تعریف کر رہے ہیں۔

ناسخ[1]:۔ ہاں بھئی بعض بندوں کے چھٹے مصرعہ میں اچھی اچھی تشبیہیں آئی ہیں۔ باقی تو حالی کا وشیں ہی کاوشیں ہیں۔ "وقفِ رعنائی" بمعنی "وقفِ خرامِ رعنائی" استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ناسخ ۶۰، سال پہلے سرِ دور کے تھے اس واسطے وہ باتیں جو پچھتر سال میں نئی شاعری اور اردو زبان میں داخل ہو گئیں ان پر تعجب کرتے ہیں۔ جلال ناسخ کے اصول پر ہمیشہ کار بند رہے۔

حالی :۔ جی ہاں ضرورت شعری تھی۔ یہ دیکھئے کہ الفاظ میں ترنم کس قدر ہے۔

جلال :۔ سبحان اللہ! اسیم بر کا قافیہ زیب بر۔ یہ بھی کیا خوب ہے!

ظریف :۔ جی ہاں یہ ضرورت قافیہ تھی، یہ دیکھئے کہ "توازن" کس قدر ہے اور کچھ نہ دیکھیے۔

حالی :۔ اسے جانے دیجئے آگے سنئے۔

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویر حسن   خون عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیر حسن

یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیر حسن   نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادی پر خار میں

سرخ تکمہ ہے قبائے سبزہ کہسار میں

(اس بند کے چاروں مصرعوں پر جلال اور ناسخ نے بہت کان کھڑے کئے۔ ناسخ نے تو کہہ ہی دیا کہ "حسن کو ردیف بنانے میں کیا حسن ہوا" چھٹے مصرعے پر سب ندرت تشبیہہ کی تعریف کرتے ہیں)

حسن سے تیرے ہے اے ناطورۂ حسن آفریں   قند ق پائے حسیناں کی ادائے دل نشیں

جلوۂ رخ سے ترے گلگوں ہے دامان زمیں   بزم صحرا میں ہے تو جام شراب آتشیں

بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے

عالم نیرنگ افسوں تیرے میخانے میں ہے

وادیٔ پرخار میں اک جگر سوزاں ہے تو   دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو

کشت زار حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو   یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر

دوڑتا ہے خون کا قطرہ سبزہ کہسار پر

سب تعریف کرتے ہیں بالخصوص چھٹے مصرعے کی تعریف سب کرتے ہیں سرور تعریف کرنے والوں کو سلام کرکے کنول منشی جوالا پرشاد برق کی طرف بڑھا رہے ہیں کہ :۔

شبلی :۔ سرور صاحب! کیا کہنا ہے آپ نے سودیشی پیداوار کو بدیشی مال پر ترجیح دی ہے مادی چیزوں سے روحانی منزلوں تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ الفاظ میں ایک خوش آیند ترنم پیدا کیا ہے۔ نادر اور نئی تشبیہیں آپنے خوب پیدا کرلیں۔

[برق :۔ منشی جوالا پرشاد نام، برق تخلص نہایت ذہین و قابل شاعر اور تمام ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء سیتاپور میں پیدا ہوئے ۱۸۷۶ء میں کالج کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے ۱۸۸۲ء میں بی اے ہوکر ۱۸۸۳ء میں وکیل ہوگئے ۱۸۸۵ء میں منصف ہوئے پھر قائم مقام سشن جج ہوکر مستقلاً جج خفیفہ ہوئے ۱۹۰۹ء میں گزیٹیر کمیٹی کے ممبر تھے کہ ۱۹۱۱ء میں بعارضہ (پلیگ) طاعون لکھنؤ میں انتقال کیا۔

"فسانۂ آزاد" کے دل دادہ اپنے وقت کے بہترین نثر نگار۔ اچھے شاعر ان کی "مثنوی بہار" کی تعریف سر سید نے کی ہے۔ آپ نے بنگالی زبان کے ناولوں کا ترجمہ نہایت سلیس اردو میں کرکے اردو نثر کے خزانہ کو مالا مال کردیا ہے، آپ اردو میں ایک خاص طرز کے موجد تھے جس میں روانی، صفائی، سچے خیالات اور آمد کا اظہار ہوتا ہے۔

شکل ولباس:۔ صاف کھلتا ہوا گیہواں رنگ۔ بہت کشادہ پیشانی انگریزی وضع کے بال آڑی مانگ، روشن بڑی بڑی آنکھیں بھرے بھرے گلے نصف رخسار سے زیادہ لمبی بڑی بڑی گھنی سیاہ مونچھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ عمر تقریباً ۴۰ سال۔

ننگے سر۔ اسٹف کالر اور اسٹف کف کا سفید قمیص۔ بجائے نکٹائی کے بو لگائے ہوئے سرمئی رنگ کا انگلش کوٹ۔ اسی رنگ کا پتلون اوپر سے ایل ایل بی کا گون۔ موٹے تازہ آدمی ہیں]

(ترنم سے پڑھتے ہیں)

غزل

کیونکر کہوں کہ بیٹھا ہے تیوری چڑھائے کون

تم تو خفا نہیں ہو کسے پھر منائے کون

چتون وہ دیکھ لی ہے کہ آپے میں ہم نہیں

دل کو سنبھالے کون جگر کو بچائے کون

خنجر کو لاگ ہم سے ہے اور ہم کو یار سے

کس کو گلے سے دیکھئے آخر لگائے کون

مجکو ادب کا پاس ہے اُن کو غرور حسن

جائے تو جائے کون جو آئے تو آئے کون

وہ تو برس رہے ہیں غضب میں بھرے ہوئے

اے برق تیرے دل کی لگی کو بجھائے کون

مطلع پر تو تعریفوں کا غل مچ گیا۔ پڑھنے والے کی مترنم آواز۔ اشعار میں الفاظ کی سجاوٹ، معنی کا لطف، سب سے پہلے آتش، جرأت، تعشق، رشید، ناسخ سب نے تعریف کی۔ داغ و امیر نے مطلع دوبارہ پڑھوایا۔

دوسرا شعر داغ نے دوبارہ پڑھوایا، شعر ۳ کی ناسخ، مومن، ذوق بہت تعریف کرتے ہیں۔ شعر ۴۔ غالب۔ مومن۔

جانصاحب :- اے واہ جج صاحب سلامت رہو بھیا میرا جیوڑا خوش کر دیا، (برق سلام کرتے ہیں۔)

شبلی :- (کھڑے ہو کر) سبحان اللہ! جج صاحب! کیا صفائی زبان و محاورہ ہے۔ ہر ایک شعر آمد کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے۔"

برق :- (سب کو سلام کرکے) آپ کا حسنِ سماعت ہے۔ (شمع آگے بڑھا دیتے ہیں)

کنول حالی کے آگے آتا ہے۔ حالی شعرائے لکھنؤ کے درمیان میں پھنس گئے ہیں چاہتے ہیں کہ میں نہ پڑھوں۔ شمع اپنے سامنے سے داہنی طرف بڑھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال :- ہائیں! خواجہ صاحب یہ کیا؟

آزاد :- حضرت! آپ کو بھی پڑھنا ہوگا، میں تو آپ سے کہہ چکا ہوں کہ آپکو بھی پڑھنا ہوگا۔

حالی :- مولانا! غزل؟ حقیقتہً اس لائق نہیں کہ ایسے کاملین فن کے سامنے عرض کروں۔ کسی اور نظم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر اقبال :۔ اگر مناسب ہو تو "مدو جزر اسلام" کے چند بند عنایت ہوں

[حالی :۔ الطاف حسین (خواجہ) نام حالی تخلص ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء بمقام پانی پت انصاری خواجگان کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ جب آپ نو برس کے تھے کہ آپ کے والد خواجہ ایزد بخش صاحب نے انتقال کیا۔ اپنے بڑے بھائی اور بہن کی تربیت میں پرورش پائی۔ پہلے قرآن حفظ کیا۔ پھر سید جعفر علی سے دو چار فارسی کی کتابیں پڑھیں اور خواجہ ابراہیم حسین انصاری سے ابتدائی عربی پڑھی۔ سترہ برس کی عمر میں ہنوز تعلیم نامکمل تھی کہ شادی ہو گئی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی پانی پت سے دہلی چلے آئے ۱۸۵۶ء میں کلکٹری میں نوکری ملی۔ پھر غدر ہوا چار برس بیکار رہے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مصاحب ہو گئے۔ یہاں شاعری کی مشق شروع ہوئی اور شیفتہ اصلاح دیتے تھے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد "گورنمنٹ بکڈپو" میں ملازم ہو گئے، ترجمے کی کتابوں کی زبان بدل دیا کرتے تھے۔ اس طرح اکثر و بیشتر انگریزی کتابوں کے پڑھنے سے انگریزی ادب کا شوق ہوا۔ چار برس بعد اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو گئے، یہاں سرسید سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش بلکہ دیئے ہوئے خاکے پر "مدوجزر اسلام" تصنیف کیا۔ ۱۸۸۷ء میں سرسید کی سفارش سے آسمان جاہ مدار المہام حیدرآباد دکن نے ۷۵ روپیہ ماہوار وظیفہ کر دیا

جوان کو حیدر آباد ایک وفد میں جانے پر سو روپیہ ماہوار ہو گیا۔ ۱۹۰۳ء میں شمس العلماء ہو گئے آخر ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں انتقال کیا۔]

(تحت اللفظ)

مسدس مدوجزر اسلام

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت بڑھا جانب بو قبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحانے کی وہ ودیعت چلے آئے سب جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت کہ طالع ہوا ماہ برج سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت کہ تھا ابر میں ماہ تابِ رسالت

یہ چالیسویں سال حکم خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماوی
یتیموں کا والی۔ غلاموں کا مولی

(اس بند کے پانچویں چھٹے مصرعوں کی بہت تعریف ہوئی۔ (بہت سی صنعتیں ہیں)

خطا کار سے درگزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا   قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا   کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا   پلٹ دی بس اک آن میں اسکی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر ہو گیا رُخ ہوا کا

(ادھر ہر بند پر ڈاکٹر اقبال، اکبر، چکبست، فانی بے حد تعریف کر رہے ہیں اور حالی چاہتے ہیں کہ اب ختم کر دیں۔ ذرا رُکے ہی تھے کہ غالب بولے)

غالب :- نہیں بھئی ابھی سیری نہیں ہوئی، چند بند اور سنائیے۔

آزاد :- خواجہ صاحب! دیکھئے استاد غالب کیا فرما رہے ہیں۔

حالی :- بہتر ہے (کچھ ورق اُلٹ کر) تو پھر یہاں سے چند بند سنئے۔

یہ بجلی کا کڑکا[۵] تھا یا صوتِ ہادی   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی   اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا   حقیقت کا گُر ان کو اک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا   بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

---

۵ لکھنؤ میں کڑک بولتے ہیں۔ اور مؤنث۔

کھلے تھے نہ جو رازؔ اب تک جہاں پر
وہ دکھلادئے ایک پردہ اٹھا کر

نہ واقف تھا انساں قضا و جزا سے — نہ آگاہ تھا مبدا و منتہا سے
لگائی تھی اک اک نے لو ماسوا سے — پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

کہ ہے ذاتِ واجب عبادت کے لائق — زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

غالب :۔ بھئی خواجہ صاحب تمھارے کلام میں جو کچھ صفائی اور روانی ہے وہ بہت خوب ہے اور حقیقت میں تمھاری غزلیں تمھارے واسطے اس روانی اور صفائی بندش کے پیدا کرنے کی ذریعہ ہوئیں۔

حالی :۔ استاد سب آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا فیض ہے ورنہ میں کس لائق ہوں۔

آزاد :۔ خواجہ صاحب آپ طرز جدید کے نظموں کے دوسرے پیمبر ہیں یعنی نظم میں عاشقانہ خیالات کے علاوہ تمدنی، معاشرتی، سیاسی خیالات کو نظم کیا ہے لیکن حدود نظم اردو کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے آپکے اخلاف اس دائرے سے باہر قدم نکال کر بے راہ روی کے مسلک پر گامزن ہوگئے۔

لہ رازسے مراد راز توحید سے پردہ جہالت کا پردہ تھا۔

حالی:۔ جی ہاں مولانا! میری نافرمان امت اپنے ساتھ مجھ کو بھی بدنام کئے ہوئے ہے، کیا کروں اب تو استاد غالب کا یہ شعر ہر وقت پڑھا کرتا ہوں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شمع آگے بڑھاتے ہوئے۔

حالی اپنے سامنے کا کنول اٹھا کر رشید کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

رشید:۔ کنول اپنی طرف کھسکا کر سلام کرتے ہیں۔

[رشید:۔ سید مصطفےٰ میرزا نام پیارے صاحب عرف رشید تخلص ابن احمد میرزا صاحب صابر (آتش کے چھوٹے بیٹے) سید صاحب تعشق کے بھتیجے، $\frac{۱۲۶۳ھ}{۱۸۴۷ء}$ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ میر انیس کی دختر تھیں، ان کی شادی انیس کی پوتی میر عسکری صاحب رئیس کی دختر سے ہوئی تھی۔ اپنے بڑے چچا میاں عشق کے شاگرد تھے ان کی توجہ زیادہ تر زبان رکھی غزلوں پر عشق و تعشق کی اصلاح ہوئی مرثیہ کبھی کبھی انیس کو دکھلاتے تھے۔

ان کی غزلوں میں سلاست زبان حلاوت اور پابندی محاورات کا بہت لحاظ ہے ان کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند تھیں جدت خیال کم ہے ان کی رباعیاں پیری کے مضمون پر لاجواب ہیں مرثیہ میں انھوں نے بہار کا اضافہ کیا $\frac{۱۳۳۷ھ}{۱۹۱۸ء}$ بعمر ۷۳ سال انتقال کیا لکھنؤ کے ادبی حلقہ میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اپنی ہڑوال میر عشق کی بغیہ رکاب گنج میں مدفون ہیں۔

نورالمبا چہرہ روشن آنکھیں کشادہ پیشانی، سفید خشخشی ڈاڑھی سفید
شرعی مونچھیں سفید پٹے پر سر پہ، دوپلی شالی ٹوپی کنارے پر بیل،
کلیوں دار اچکن آستین کلائیوں کے پاس بھنسی بھنسی، سفید بڑی مہری
کا پائجامہ بڑے منکسر المزاج نہایت متواضع بڑے وسیع الاخلاق۔]

شبلی :۔ جناب پیارے صاحب رشید اپنا کلام ارشاد فرماتے ہیں۔

رشید :۔ میں اس مجمع میں، جہاں میرے بہت سے بزرگ تشریف فرما ہیں کیونکر
زبان کھول سکتا ہوں۔

انیس :۔ بھئی پیارے پڑھو! یہ تو بزم مشاعرہ ہے یہاں پس و پیش کا کیا
موقعہ ہے۔

تعشق :۔ پیارے! پڑھتے کیوں نہیں دیکھو حضرت (انیس کی طرف اشارہ کرکے)
حکم دے رہے ہیں۔

رشید :۔ (دونوں بزرگوں کی طرف مخاطب ہو کر) حضرت جد محترم و عم
مکرم کے حکم کی تعمیل ہے عرض کرتا ہوں (انیس کی طرف مخاطب ہو کر)
ایک رباعی اور ایک بند ساقی نامہ کا عرض کر دوں پھر چند شعر غزل کے۔

انیس :۔ ہاں ہاں ضرور! میاں پیارے تم نے بھی تو ساقی نامے خوب کہے ہیں
ضرور پڑھو اور بھئی ایک رباعی پیری کے حال میں بھی سنا دو۔

رشید :۔ پیری کے حال میں ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

پیری وہ ہے کہ جس کا مارا ہوں میں ۔۔۔ اے بھائیوں مہمان تمہارا ہوں میں
چھپ جاؤں نظر سے ہے وہ ہنگام قریب ۔۔۔ وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں

ہر طرف سے تعریفیں ہوتی ہیں۔ ناسخ، آتش، مصحفی، انیس، دبیر، تعشق، حالی

اکبر، چکبست، شاد سب تعریف کرتے ہیں۔

ملاحظہ ہو۔ ایک بند ساقی نامہ کا۔

ساقیا حد کا گنہگار تھا یہ عبد ذلیل   بخدا خلد میں جانے کی نہ تھی کوئی سبیل

ہے الفت تری پائی گئی الفت کی دلیل   آئے تھے غصے میں بالیں پہ مری عزرائیل

پینے والا ہے مرے ساقی کا یہ جان گئے

منھ مرا دیکھتے ہی ہنس دے پہچان گئے

محسن، دبیر، تعشق، امیر مینائی سب بے حد تعریف کرتے ہیں۔

انیس :۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ یہ میدان تمھارے ہی ہاتھ رہا۔

رشید :۔ (کھڑے ہو کر نانا کو سلام کرتے ہیں) اب چند شعر غزل کے (تعشق کی طرف دیکھ کر۔)

تعشق :۔ ہاں بھئی پیارے اب غزل سناؤ۔

رشید :۔ عرض کرتا ہوں ملاحظہ ہو غزل۔ (تحت اللفظ)

غزل

ہر اک تربت کے گل چومیں نشانِ پائے جاناں کو

چلے دو گام جنت کر دیا گورِ غریباں کو

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ایماں کو

کہ بسم اللہ کہہ کر چاک کرتا ہوں گریباں کو

تمھارے دم سے ہے اے جاں ہمارا شہر میں آنا

نہیں منظور گر تم کو نہ چھوڑیں گے بیاباں کو

مجھے جوشِ جنوں ہے لیکن اتنی ہوشیاری ہے

سمیٹے ہاتھ دامن میں بچاتا ہوں گریباں کو

گھرا ہے مے کدے پر ابرِ شہ ماکر نہ برسے گا

ذرا دم بھر نہ رہنے منع کر دو اپنے گریاں کو

جو ممکن ہو تو کچھ سامان راحت جمع ہو جائے

پریشانی ستایا کرتی ہے تیرے پریشاں کو

نظر بازی کی کیفیت ترے قیدی کو حاصل تھی

اب آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں روزنِ دیوارِ زنداں کو

رشید ان کو پکار اقبر سے اغیار کہتے ہیں

بتائیں کس نے باتیں ساکنِ شہرِ خموشاں کو

مطلع پر آتش، تعشق، امیر، داغ، مصحفی۔ جرأت تعریف کرتے ہیں حسنِ مطلع پر مومن، ذوق، تعشق، غالب، امیر، جلال، برق، شاد، عزیز ثاقب۔

۳۔ غالب، داغ، چکبست، فانی، نسیم۔

۴۔ فانی۔ ریاض، اقبال، ثاقب، برق۔

۵۔ ریاض، غالب، داغ، برق، جلال

۷۔ سب مل کر تعریف کرتے ہیں۔

۸۔ جلال، امیر، ناسخ، داغ، چکبست وغیرہ۔

شبلی:۔ تعریف ختم ہونے پر (کھڑے ہو کر)

"جناب رشید صاحب! ماشاء اللہ آپ مرکز لکھنؤ کی زبان کے آخری پیغمبر تھے کیوں نہ ہو کس کے پوتے اور کس کے نواسے آپ کے اشعار تو مجمع البحرین کے دُر ہائے شاہوار ہیں یہ ایک آئینہ ہے جس میں حضرت تعشق کے طرز اور دبیر کی زبان کے بیک وقت جلوے دکھائی دیتے ہیں۔

رشید کھڑے ہو کر سلام کرتے ہیں۔

اب کنول اکبر کی طرف چلا۔

اکبر الہ آبادی

[لسان العصر سید اکبر حسین اکبر ولادت الہ آباد میں ۱۶ر نومبر ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء کو ہوئی، ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا، کچھ دنوں پریکٹس کی تھی کہ نائب تحصیلدار ہو گئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے ہی ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد منصف ہو گئے، بالآخر جج خفیفہ کے عہدے پر مامور ہوئے۔

ان کا انداز بیان اور طرز تخیل بالکل نرالا ہے صفائی اور سادگی ہر جگہ نمایاں ہے انھوں نے شاعری کے قدیم رنگ کو خیر باد کہہ کر اپنے لئے ایک نہایت کارآمد میدان تلاش کر لیا جب انھوں نے ملک و قوم کی حالت تباہ ہوتے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا جانتے تھے کہ آہ و فریاد سے زمانہ نہ چونکے گا چٹکیاں لے لے کر گدگدیاں کر کے چونکا دیا اور دلوں کو ابھارنے کی کوشش کی، مغرب کی کورانہ تقلید

ے مشرق کو بچنے کی پُرامن راہیں سمجھا دیں روزمرہ کی زندگی کی اصلاح کی تدبیر بتائی۔ ۱۹۲۱ء ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا۔

لباس و وضع :۔ عمر تقریباً ۷۵ سال۔ پیشانی، رخسار وں آنکھوں کے پپوٹوں پر کبرسن سے جھریاں۔ تیوری پر بل، بڑے بڑے کان، لمبا چہرہ، روشن آنکھیں، ڈاڑھی چھدری، کلوں پر بہت کم بال ٹھوڑی پر کچھ زیادہ (تقریباً ۴ انگل لمبے) لیکن اتنے چھدرے کہ بالوں کے نیچے سے جلد کا رنگ دکھائی دے رہا ہے، سر پر سفید بال جن کا کچھ حصہ ٹوپی کے نیچے سے دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کنگھی نہیں کی ہے ڈاڑھی مونچھوں اور سر کے بالوں میں خضاب نہیں کیا ہے، کانوں پر بھی کچھ کچھ سفید بال اُگے ہوئے ہیں۔

ترکی ٹوپی، سیاہ شیروانی، اوسط درجہ کی سفید مہری کا پاجامہ۔]

کنول اکبر نے رشید سے سلام کر کے لے لیا۔

اکبر :۔ جناب رشید صاحب آپ کے اس اعلیٰ ادبی شاہکار کے بعد بھلا میں کیا عرض کر سکتا ہوں میری نظم کیا ہے ٹھٹھول بازی ہے بھلا اس کا کیا موقع ہے۔

رشید :۔ واہ جج صاحب آپ اس کو ٹھٹھول بازی کہتے ہیں حقیقۃً یہ ایک لاجواب درس اخلاق ہے جس کو خوش آیند بنانے کے لئے آپ نے اس کی یہ صورت بنائی۔

اکبر :۔ بہرحال آپ کے بعد کچھ عرض کرنا گستاخی ہے۔

رشید:۔ نہیں نہیں آپ کو ہمارے سر کی قسم ضرور پڑھیئے ایک آدھ قطعہ یا رباعی بھی ضرور عنایت کیجئے۔

اکبر:۔ دیکھیئے جو جو رباعی یاد آتا جاتا ہے سنائے دیتا ہوں ملاحظہ ہو رباعی۔

(تحت اللفظ)

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے ۔۔۔ کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن ۔۔۔ ازار بند کو کہدیں گے جیس بیجا ہے

تعریف۔ شاد، رشید، ظریف، اقبال، ثاقب، عزیز، تعریف کرتے ہیں ادھر آتش:۔

غالب، مومن:۔ "عقدہ کشائی" اور "جیس بیجا" میں کتنا عمدہ کنایہ ہے اور کیا پُر معنے تضاد کیا کہنا واہ صاحب واہ پھر ارشاد ہوا۔

اکبر دیر تک سلام کرتے ہیں اور پھر رباعی پڑھتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد:۔ ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں ۔۔۔ جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر ۔۔۔ تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

سرور، برق، حالی، چکبست، امیر، عزیز، ظریف، فانی، ثاقب تعریف کرتے ہیں۔

اب یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر ۔۔۔ مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں ۔۔۔ نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس

ان دونوں اشعار پر حالی پھڑک اٹھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے بے حد تعریف کرتے ہیں۔

سناؤں تم کو ایک فرضی لطیفہ کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے کہ بیٹا کرے گر تو ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلےٰ کو تجھ سے بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی مجھے سمجھا ہے کوئی ہریرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود نہیں منظور مغز سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلےٰ
تو استعفاء مرا با حسرت و یاس

پورا مجمع بہت مسرور ہے ہر طرف سے آوازوں کا غل بلند ہے پورا مجمع ہنسی اور مسرت سے بے حال ہو رہا ہے۔

اکبرؔ سلام کر کے شمع محفل کی طرف بڑھاتے ہیں

فرحت اللہ بیگ :۔ (کھڑے ہو کر) خان بہادر صاحب کا کلام حقیقت میں درس اخلاق ہے سلیس زبان اور کہنہ مشقی کی نظم میں آپ نے اخلاقی، سیاسی روحانی، مذہبی، اصلاحی عناصر ابھارے ہیں۔ ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں)

اب شمع چکبست کے آگے آتی ہے۔

چکبست اخلاقاً اکبر سے معافی مانگتے ہیں ان کے بہت سے دوست اصرار کرتے ہیں۔

(مثلاً برق، عزیز، ظریف، اقبال، فانی، ثاقب)

پنڈت جی ایک غزل پڑھنا ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی ان یاروں کے مجمع میں آئے اور خالی نکل جائے۔

چکبست:۔ (مسکرا کر) بہت خوب! آپ حضرات کے حکم کی تعمیل بسر و چشم کرتا ہوں۔

(آتش کی طرف دیکھ کر) عرض کرتا ہوں۔

آتش:۔ بسم اللہ کیجئے۔

چکبست: (تحت اللفظ)

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا

بہار آئی ترقی پر ہے سودا دم بہ دم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پہ ناز کرتا ہے کرم میرا

کہا غنچے نے ہنس کر واہ کیا نیرنگِ عالم ہے
وجود گل جسے سمجھے ہیں سب وہ ہے عدم میرا

کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے

الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا

تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر

یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا

اُکھڑ ہی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں

شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی

اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

زباں حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے

مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اسقدر میں نے

کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخِ حرم میرا

مطلع پر مومن تعریف کرتے ہیں واہ پنڈت جی! کیا خوب مطلع ہے پھر ارشاد ہو (غالب سے) مرزا نوشہ مطلع سنا بھئی یہ تو خوب کہتے ہیں۔

غالب: میری افتادِ طبیعت کے بالکل موافق ہے۔

دوسرے مطلع پر بہت جوش و خروش سے تعریف ہوئی، میر و سودا بھی تعریف کرتے ہیں۔

شعر۳۔ (امیر مینائی) محشر کا کوروی بہت تعریف کرتے ہیں۔ امیر پھر

پڑھواتے ہیں۔

شعر۴۔ ذوق، سودا، ناسخ تعریف کرتے ہیں۔

شعر۵۔ غالب، مومن، سودا بہت تعریف کرتے ہیں۔

شعر۶۔ مصحفی، آتش، نسیم، غالب، جلال، رشید، تعشق سب تعریف کرتے ہیں۔

شعر۷۔ آتش بے حد تعریف کرتے ہیں، ثاقب، فانی، ظریف، عزیز، ریاض، شاد، رشید، اکبر، برق، داغ جلال بے حد تعریف کرتے ہیں۔ صفائی بندش، ندرت خیال کی تعریف ہوتی ہے۔

شعر۸۔ داغ، امیر، جلال، رشید، تعشق، برق، ثاقب، اکبر تعریف کرتے ہیں۔

شعر۹۔ سب تعریف کرتے ہیں۔ دوبارہ پڑھوایا جاتا ہے۔

شعر۱۰۔ واجد علی شاہ بے قراری سے تعریف کرتے ہیں۔ ناسخ، آتش، انیس، دبیر، تعشق، امیر، جلال، برق، رشید، ظریف، ثاقب بے حد پسند کرتے ہیں۔

شعر۱۱۔ اس شعر پر ایک ہنگامہ ہے تمام شعراء متحد اللفظ ہو کر تعریف کرتے ہیں، دوبارہ پڑھنے کی ہر طرف سے پکار مچتی ہے پھر پڑھیئے۔ سیری نہیں ہوتی، ناسخ کیا پیارا انتقاد ہے کیا لاجواب لفت و نشر ہے۔ سبحان اللہ کیا خوب شعر ہے ارے صاحب بیت الغزل یہی ہے۔

چکبست:۔ (کھڑے ہو کر) سلام کرتے ہیں اور شمع آگے بڑھا دیتے ہیں۔ شاد کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ :- غزل ختم ہونے پر۔

واہ پنڈت جی کیا لطف بیان ہے کیا ہی سلاست و شیرینی زبان کے ساتھ نادر مضامین رشتۂ نظم میں پروئے ہیں سبحان اللہ حقیقت میں آپ نے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں بھی غزل کے مضامین نظم کئے ہیں۔ آپ نے مغرب کی کورانہ تقلید سے گریز بھی کیا اور مشرقی تہذیب و تمدن کا سر رشتہ چھوڑے بغیر ناصحانہ انداز میں اصلاح اخلاق و معاشرت کا لاجواب سبق پڑھایا۔

[پنڈت برج نرائن چکبست :- کشمیری برہمن نسل کے آدمی ہیں۔ بزرگوں کا وطن فیض آباد تھا یہ بھی فیض آباد ہی میں ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ آ گئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کیا پھر وہیں سے وکالت پاس کرکے لکھنؤ ہی میں پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۲ ار فروری ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء کو ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے بریلی سے واپسی پر دماغ پر فالج گرا اور معاً وہیں انتقال ہو گیا۔

ان کی شاعری بچپن ہی سے شروع ہوئی اساتذہ کا کلام بغور مطالعہ کیا۔ آتش انیس و غالب کے کلام سے ان کی شاعری کو روحانی غذا میسر ہوئی اور اسی سے شاعری کا نشو و نما ہوا، نہ کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ کوئی تخلص رکھا چکبست ان کا خاندانی نام ہے نہ کہ تخلص مرثیہ میں انیس اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں، لیکن

جہاں ہیں وہ بہت پرکار ہیں جن سے غالب کی تقلید کا اظہار ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں یہ بڑی کامیابی ہے کہ شاعر کسی کی تقلید کر کے اپنے کلام میں اس کا اصلی رنگ، دکھا دے اور چکبست اس میں نہایت مشاق ہے مسدس میں وہ انیس کے الفاظ پیش کرتا ہے۔ غزل کے مضامین میں وہ آتش کا پرکالہ ہے فلسفیانہ خیالات میں وہ اپنے وقت کا غالب ہے۔

انھیں نے اپنی ذاتی ذہانت اور سخنوری سے سیاسی تحریکوں اور اصلاحات اور سانحات پر متعدد شاندار نظموں سے ایک نئی کیفیت و لطف پیدا کر دیا ہے ان کے یہاں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا دل فریب خاصہ منظروں میں مناظر قدرت کی عکاسی (بذریعہ الفاظ) کرنا ہے انھیں نے اپنے جاننے والوں کے انتقال پر کشیرہ مرثیے بھی لکھے ہیں جن میں اپنے جذبات کا نہایت دردمندانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ سیاسی اور ملکی واقعات کو نہایت کامیابی کے ساتھ شاندار انداز میں بیان کرنا چکبست ہی کا کام ہے۔

اقبال عالم بھر کے مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ چکبست صرف اہل وطن کو جوش دلاتا ہے اقبال کا کلام دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ چکبست کا کلام دل کو بیتاب کر دیتا ہے۔ اقبال کا کلام فلسفہ کے پر پرواز سے اڑتا ہے چکبست کا کلام جذبات انسانی پر اثر ڈالتا

ہے ملک نے ان کی کافی قدر دانی کی جس کے یہ مستحق تھے اور آج ان کی جگہ تمام اردو شعراء اور ادیبوں کی بزم میں صف اول میں صاف نظر آتی ہے۔

شکل و لباس :۔ نہایت گورے سُرخ و سفید رنگ کے کشمیری نژاد آدمی عمر تقریباً ۴۴ سال عینک لگائے ہوئے داڑھی منڈی ہوئی مونچھیں، سیاہ بہت گھنی جس سے اوپر کا ہونٹ بالکل چھپا ہوا ہے، کشادہ پیشانی دُہرے بدن کے آدمی اوسط درجہ کا قد نہایت جامہ زیب ہنس مکھ سیاہ فلٹ کی پارسی ٹوپی، سیاہ شیروانی تنگ مہری کا چوڑی دار سفید پائجامہ۔]

شادؔ :۔ سید علی محمد نام شادؔ تخلص $\frac{۱۲۶۳ھ}{۱۸۴۶ء}$ میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے ۴ برس کی عمر سے تعلیم شروع ہوئی (مشہور ہے کہ ان کی تربیت سر سید مرحوم کے ذمہ تھی) شادؔ کی شاعری کا دور انکی پندرہ برس کی عمر سے شروع ہوا۔ اصلاح کلام شاہ الفت حسین فریادؔ شاگرد خواجہ میر دردؔ کی ہوئے شادؔ نے اپنی تمام عمر اردو کی خدمت گذاری میں گذاری جس کے صلے میں گورنمنٹ سے "خان بہادر" کا خطاب ملا اور ایک ہزار روپیہ سالانہ ملتا رہا ۲۲ سال آنریری مجسٹریٹ رہے اور فیصلہ ہمیشہ اردو ہی میں لکھا $\frac{۱۹۲۷ء}{۱۳۴۵ھ}$ میں بعمر ۸۱ سال انتقال کیا۔

شادؔ کے کلام میں فلسفہ، اخلاق اور توحید کا عنصر شامل ہے

انداز بیان میرؔ سے ملتا جلتا ہے کہنہ مشق استادوں کی صحبت کا فیض ان کی پختگی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرؔ، انیسؔ و مومنؔ سے بھی فیض حاصل کیا۔ انیسؔ کا تتبع مرثیہ میں کیا ہے اس سے شادؔ کے کلام میں سب سے ممتاز چیز زبان کی صفائی و سادگی و شیرینی اسی کے ساتھ ساتھ منتخب الفاظ کا استعمال ہے، شادؔ کی غزل سوز و گداز میں میرؔ کے کلام کا مزہ دیتی ہے۔ یہ تصوف کی چاشنی میں دردؔ کا سا درد پیدا کرتے ہیں ان کے کلام کا مجموعہ "میخانہ الہام" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

شکل و لباس:- دوہرے بدن کے آدمی، کھلتا گندمی رنگ خشخشی ڈاڑھی بہت سفید کتری ہوئی مونچھیں اور سر کے بال بھی سفید چھوٹے چھوٹے برابر سے کترے ہوئے، آنکھوں پر عینک لگاتے ہیں ترکش کیپ، دھاری دار کپڑے کی شیروانی، علی گڑھ کٹ کا پائجامہ لباس کے اوپر سبز رنگ کا جبہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اسی پر خان بہادر کا میڈل گلے میں ڈالے ہیں۔]

جگبستؔ کو سلام کر کے شادؔ نے کنول اپنی طرف کھسکایا۔

[شادؔ کی باری آنے پر تمام مجمع میں اشتیاق کے آثار پیدا ہو گئے پسندیدگی عوام کی ایک لہر دوڑ گئی۔

فرحت اللہ بیگ:- جناب سید علی محمد صاحب شادؔ اپنا کلام ارشاد فرماتے ہیں۔ (ہر طرف سے) بسم اللہ بسم اللہ ہم سب کمال اشتیاق سے

گوش بر آواز ہیں۔

شاد۔ (درد کی طرف مخاطب ہو کر) اجازت ہے؟ (پھر انیس کی طرف) عرض کروں۔

دونوں (درد و انیس) بسم اللہ بسم اللہ (شاد ایک لہجے میں غزل پڑھتے ہیں۔)

غزل

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں برابر ہوں
حقیقت میں وہی میخوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

عروج بام حق تک ہے رسائی دار سے ممکن
قدم کا کام جو لے سر سے یہ زینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا صاف رکھ لے شاد پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

مطلع :- میر انیس، حسن، درد، میر، مصحفی، آتش، مومن، غالب، نسیم، امیر، جلال، رشید، عزیز، فانی، چکبست، ثاقب سب تعریف کرتے ہیں

شعر۲۔ بہت زبردست تعریفوں کا غل اٹھتا ہے ایک ہنگامہ برپا ہے۔ مشکل سے کوئی شاعر ہوگا جو تعریف اس شعر کی نہ کر رہا ہو۔ تین بار یہ شعر پڑھوایا جاتا ہے۔

شعر۳۔ ذوقؔ، سوداؔ، ناسخؔ، دبیرؔ، نسیمؔ، برقؔ، داغؔ بہت تعریف کرتے ہیں۔

داغؔ:۔ حضرت یہ شعر پھر ارشاد ہو لاجواب شعر ہے۔

شعر۴۔ بناوٹ کا مضمون ہے خوب سجا ہوا شعر ہے۔ سوداؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، جلالؔ، چکبستؔ سب تعریف کرتے ہیں۔ آتشؔ بھی تعریف کرتے ہیں۔

شعر۵۔ خواجہ دردؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، محسنؔ، امیرؔ، برقؔ، فانیؔ، ثاقبؔ تعریف کرتے ہیں۔

شعر۶۔ مطلع کی طرح اس شعر کی بھی وہی شعراء تعریف کرتے ہیں۔

بہت زبردست ہنگامہ مچ جاتا ہے۔ جب ذرا کچھ تعریفوں کا کم ہوا اور شور و غل رکا تو۔

مرزا فرحت اللہ بیگ (کھڑے ہوئے) "سبحان اللہ حضرت شادؔ آپ نے دل شاد کر دیا آپ کی غزلوں کی کیا تعریف ہو سکتی ہے فلسفہ و اخلاق کا درس ہے، تصوف و طریقت کا سبق ہے حضرت انیسؔ کی شیریں زبانی و شیوہ بیانی میں حضرت میرؔ کا سوز و گداز حضرت دردؔ کا تصوف اور حضرت غالبؔ کا فلسفہ نہایت منتخب الفاظ میں جمع کر دینا آپ ہی کا کام ہے:

شادؔ:۔ (سلام کرکے) آپ حضرات کا حسن سماعت ہے اور ان بزرگ ہستیوں کا فیض روحانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میرا کلام کیا حضرت (انیسؔ کی طرف اشارہ کرکے) کی ہم نشینی کا فیض ہے۔

جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہم آں خاکم کہ ہستم
را پنے آگے کی شمع ریاض خیر آبادی کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

[ریاض خیر آبادی :۔ منشی سید ریاض احمد المتخلص ریاض، ابن منشی طفیل احمد خیر آباد میں سنہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے خیر آباد کے مدرسۂ عربیہ میں تعلیم حاصل کی، فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی شاعری شروع کر دی پہلے منشی اسیر مرحوم سے پھر امیر احمد امیر مینائی سے تلمذ اختیار کیا۔ خیر آباد ہی سے ایک رسالہ "گل کدۂ ریاض" جاری کیا۔ کچھ مدت بعد ریاض الاخبار گورکھپور سے نکالا جہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس کی سررشتہ داری کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اسکے پہلے جب لکھنؤ میں تھے اور "ریاض الاخبار" نیا نیا چلا تھا جب ہی ایک ضمیمہ موسوم بہ "فتنہ" و "عطر فتنہ" نکالتے تھے جس میں شوخ مضامین اور منتخب اشعار ہوا کرتے تھے گورکھپور سے خیر آباد ہی کے متوطن ہو گئے آخر ۱۳۵۳ھ / ۱۹۲۵ء میں گورکھپور کی خاک میں مل گئے۔ "ریاض رضوان" مجموعۂ کلام کا نام رہ گیا۔

ان کے کلام میں شباب کی رنگینیاں حسن و عشق کی عملی زندگی کی داستانیں ہیں کبھی معشوق سے چھیڑ چھاڑ، کہیں پیر مغاں سے دل لگی ناصح اور واعظ کی ہجو ملیح غرض نشۂ شباب سے ہر وقت سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز کے بجائے شراب و مستی کا ذکر زیادہ ملے گا۔ جو ان کے کلام کا مخصوص موضوع ہے "خمریات"

ان سے بہتر اور زیادہ تر کسی کے یہاں نہ ملیں گے۔ ریاض کا معشوق "مثالی" یا "خیالی" نہیں ہے وہ اسے اپنے برابر کا ایک جنس لطیف و نازک سمجھتے ہیں۔

شکل و شمائل :۔ گورے گورے آدمی ہیں۔ ۸۰ سال کی عمر، گول ڈاڑھی سفید متوسط لمبائی کی، مونچھوں کے لب ترشے ہوئے ہیں اور مونچھوں کے سرے ڈاڑھی میں پیوست ہو گئے ہیں۔ وہ ہرے ڈیل اور مناسب قد و قامت کے آدمی ہیں۔ سیاہ شیروانی، سیاہ گول مخملی ٹوپی، نصف پیشانی سے بچی ہوئی۔ پٹے نہیں رکھتے۔ خشخشی بال ہیں، آنکھوں کے نیچے رخساروں پر جھریاں ہیں۔]

شاد :۔ بسم اللہ ریاض صاحب بہت مدت کے بعد آج آپ کا کلام سننا میسر ہوگا۔

ریاض :۔ (شاد صاحب سے کنول لے کر) آپ نے بڑی زحمت کی، میں تو خود کنول اٹھا لیتا خان بہادر صاحب معاف کیجئے گا آپ کے بعد بھلا کون موقع ہے۔

شاد :۔ واہ صاحب! موقعہ کیوں نہیں نہایت برمحل ہے۔ پڑھیئے بھی آپ کا کلام تو ایک بادۂ کیف آگیں ہے۔

فرحت اللہ بیگ :۔ جناب منشی ریاض احمد صاحب خیرآبادی اپنا کلام ارشاد فرماتے ہیں۔

ریاض :۔ (امیر کی طرف اشارہ کرکے) اجازت ہے کچھ عرض کر دوں؟

امیر :۔ بسم اللہ پڑھیئے۔

(ریاضؔ :- کیف آگیں ترنم کے ساتھ)

دیکھے تو کوئی فیض نسیم بہار کا | گُل ہو گیا چراغ ہمارے مزار کا
تسکین دے دو وعدۂ فردا سے جھوٹ سچ | ٹوٹے نہ آسرا دلِ امیدوار کا
خم دوش پر بغل میں صراحی وہ روز حشر | اٹھنا مزار سے دو کسی بادہ خوار کا
رکھنا پڑا ہمیں خم و مینا کو سر بمہر | کوئی بھی آدمی نہ ملا اعتبار کا
جب تک ملے گی قرض پیئے جائینگے ضرور | ہم جانتے ہیں مُفت ہے سودا اُدھار کا
بوتل جب اسکے حجرے میں بھولی بھری ملے | زاہد بھی آدمی ہے بڑے اعتبار کا
اُمڈا ہوا جہان وہ میدانِ حشر میں | چلنا وہ جھوم جھوم کے مجھ بادہ خوار کا
کتنی ہی مجھ سے توبہ ملی ٹوٹ ٹوٹ کر | اس سے نبھے گا ساتھ نہ مجھ بادہ خوار کا
پی پی کے اس نے سجدہ کیئے ہیں تمام رات | اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا
خم سے نہو وہ سیر میں چلّو سے سیر ہوں | وہ ظرف شیخ کا ہے یہ مجھ مے گسار کا

اُمید ہے کہ شب کو بھی ہو شغلِ مے ریاضؔ
مُنھ صبح ہوتے دیکھ لیا روزہ دار کا

نسیمؔ، آتشؔ، مصحفیؔ، تعشقؔ، امیرؔ، داغؔ، جلالؔ، برقؔ، سرورؔ، چکبستؔ، اکبرؔ، ثاقبؔ تعریف کرتے ہیں۔

مولانا شبلی :- (کھڑے ہو کر) واہ ریاض صاحب یہ آپ ہی کا کام ہے کہ معشوق کے کردار کو اور زاہد پرہیزگار کو انہی کے الفاظ حرکات و سکنات سے اپنے اشعار میں یوں دکھاتے ہیں کہ پورا نقشہ ایک پُرلطف طریقہ سے پیش نظر آجاتا ہے۔

خمریات کے معاملہ میں تو آپ نے وہ سماں باندھا ہے کہ ساقی، صراحی، سبو، شاعر، پیمانہ اور پیر مغاں بلکہ در و دیوار میخانہ سب مست نظر آتے ہیں۔

ریاض:۔ (سلام کرکے) اپنے آگے کا کنول مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

[عزیز:۔ مرزا محمد ہادی نام، عزیز تخلص عمر ۵۳ سال ولادت لکھنؤ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء۔ سکونت محلہ اشرف آباد (وکٹوریہ اسٹریٹ) لکھنؤ۔ انتقال لکھنؤ ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء۔ آپ کے مورث اعلیٰ شیرازی النسل تھے۔ اجداد کشمیر میں متوطن ہو گئے اس کے بعد اودھ کے دور حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے آپ کی ولادت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اپنے خاندان کے اصول کے مطابق تحصیل علم کرکے فاضل ہو گئے سات برس کی عمر سے سایۂ پدری سے محروم ہو گئے لیکن تحصیل علم سے منھ نہ موڑا۔

فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اردو میں میر و غالب کی تقلید کرتے تھے اور مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی سے مشورۂ سخن لیتے تھے عزیز منجملہ ان حضرات کے ہیں جنھوں نے غزل کو راہ راست پہ لانے کی (اپنے استاد صفی صاحب کے کہنے کے بموجب) کوشش کی۔ فرسودہ اور سوقیانہ مضامین اور رکیک الفاظ سے یک قلم گریز کی، طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا برابر خیال رکھتے تھے۔

آپ کے کلام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ غزل میں اس قدر مرثیہ

رونا اور ماتم کا عنصر نامناسب ہے جس سے طبیعت پراگندہ ہو جائے، نیز یہ کہ عزیز کبھی تصیدے میں معنویت میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ الفاظ ان کے خیالات کا مفہوم نہیں ادا کر سکتے۔" ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء کو بعمر ۵۳ سال انتقال کیا۔

شکل و لباس :۔ دہرے بدن کے بلند بالا اچھے خاصے فربہ آدمی ہیں سانولا رنگ تھا بہت خفیف چیچک کے داغ اِکّا دُکّا چہرے پر، پھولے پھولے رخسار، روشن آنکھیں، ڈاڑھی بہت مہین کہ صرف بالوں کا شیڈ رخساروں پر نمایاں تھا موچھیں اچھی خاصی گھنی۔ ایک آدھ بال سفید ہوا تھا سر پر انگریزی بال مگر اتنے چھوٹے کہ مانگ نہیں نکلتی تھی، عام طور سے سیاہ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے مگر مشاعرے میں بالعموم ننگے سر بیٹھتے تھے۔ سیاہ شیروانی۔ سفید بڑے پائچوں کا پائجامہ۔ سفید جرابیں۔]

عزیز (تہذیباً دیاضن کو سلام کرکے) نہایت مترنم آواز میں بہت دل کش لہجہ کے ساتھ یہ غزل شروع کرتے ہیں۔

تعریفیں :۔ مطلع غالب، مومن، ناسخ

شعر (۲) آتش، مصحفی، امیر، جلال

شعر (۳) امیر مینائی، ذوق

شعر (۴) و (۵) (۶) و (۷) تعشق، جلال، داغ، امیر۔

شعر (۸) و (۱۰) جلال، داغ، امیر، تعشق، رشید

غزل

خدا محفوظ رکھے عشق کے جذبات کامل سے
زمیں گردوں سے ٹکرائی جہاں دل مل گیا دل سے

بدل جاتی ہے دنیا رنگِ محفل میں تغیر ہے
یہ دامن جھاڑ کر کون اٹھ گیا ہے آج محفل سے

حجابِ ناز سے آراستہ ہو کر نہ یوں نکلو
ابھی واقف نہیں اچھی طرح تم رنگ محفل سے

کیا مجنوں نے نالہ، نجد کے ذروں نے لَو دیدی
جھلک اٹھا یہ کس کا حسن عالم سوز محمل سے

ٹھہر میں تیری محویت کی اک تصویر تو لے لوں
ارے خلوت میں باتیں کرنے والے مضطرب دل سے

کوئی دیکھے تو مد و جزر دریائے محبت کا
پلٹ جاتی ہے پھر کشتی مری ٹکرا کے ساحل سے

نظام ہر دو عالم آج ہے اس دل کے قبضے میں
جسے کل تک لہو کی بوند بھی کہتے تھے مشکل سے

سنبھل اے گردشِ دوراں ابھی منظور ہے تجھ کو
دکھا دوں اُٹھنے والے کس طرح اُٹھتے ہیں محفل سے

رگِ جاں بن گیا جادہ زمینِ دشتِ غربت کا
یہ کون آواز دیتا ہے مجھے رہ رہ کے منزل سے

نثار اس عزم کے الٹی چھری سے ذبح کرتے ہیں

کرے گا کون جان اپنی عزیز اب ایسے قاتل سے

عزیز اعجاز حسن روح پرور کی کوئی حد ہے

ہزاروں دل بنا ڈالے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے

عزیز سب تعریف کرنے والوں کو سلام کرکے بیٹھے ہی تھے کہ

مرزا فرحت اللہ بیگ :۔ (کھڑے ہو کر) جناب عزیز کیا کہنا ہے، سبحان اللہ الفاظ کا ترنم جس سے دل کشی بڑھ جاتی ہے آپ ہی کا حصہ ہے جیسے بلند مضامین ہیں ویسے ہی اعلیٰ اور منتخب الفاظ حقیقتہً آپ غزل کو راہ راست پر لانے میں کوشاں رہے۔

(عزیز اس تنقید کا شکریہ ادا کرکے اپنے سامنے کا کنول ظریف کی طرف بڑھا دیتے ہیں)

ظریف (سلام کرکے کنول اپنے سامنے مناسب طور پر رکھ لیتے ہیں)

ظریف کے پاس کنول کا پہونچنا تھا کہ محفل بھر میں ایک اشتیاق کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور ہر شخص ہمہ تن گوش بن جاتا ہے۔

ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں، ظریف صاحب! ہم کو بہت اشتیاق ہے، آپ کی نظم موسوم بہ "میونسپلٹی اور میونسپل کمشنر" کے سننے کا۔

ظریف :۔ حضرت یہ نظم تو بہت طویل ہے اور وقت بہت کافی آچکا ہے۔ بہت پڑھنے والے باقی ہیں۔

اکبر اور چکبست :۔ جناب ہم سب کو اشتیاق ہے آپ تاخیر کا بالکل خیال نہ کیجئے

وہ لاجواب نظم ضرور ارشاد فرمائیے۔

ظریف:۔ بہتر! اگر سب کا اصرار ہے تو عرض کرتا ہوں۔

فرحت اللہ بیگ: (باآواز بلند) مصلح ملک و ملت حضرت ظریف لکھنوی اپنا کلام نصیحت التیام ارشاد فرماتے ہیں۔

[ظریف:۔ سید مقبول حسین نام، ظریف تخلص (برادر مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی) والد ماجد کا اسم گرامی مولانا سید فضل حسین صاحب ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء میں بمقام لکھنؤ مولوی گنج میں حضرت ظریف پیدا ہوئے۔

شکل و لباس:۔ سانولا رنگ، بلند بالا۔ متوسط ڈیل خشخاسی داڑھی فرنچ کٹ سے کچھ مشابہ، لمبی لمبی گھنی مونچھیں خندہ پیشانی، روشن آنکھیں۔ اکثر و بیشتر کلاہ پہن کر بنارسی صافہ باندھتے تھے۔ نہایت خوش پوش سلیقہ مند جامہ زیب تھے۔ سیاہ اور بہت قیمتی سرج کا ترکش کوٹ اور پتلون کی کٹ کا گھٹنہ پہنتے تھے، شہ سواری کے بہت شوقین تھے کبھی کبھی شیروانی اور ایرانی سیاہ ٹوپی پہنتے تھے۔ لکھنؤ میں پہلے ہندوستانی جنھوں نے سائیکل استعمال کی۔

۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں تعلیم شروع ہوئی، کلام مجید اپنی بڑی بھاوج (مولانا صفی کی اہلیہ) سے پڑھا فارسی کی درسی کتابیں اپنے بڑے بھائی سے پڑھیں۔ ۱۸۸۳ء تک تعلیم اس مدرسہ میں ہوئی جو مولانا صفی نے اپنے مکان پر قائم کیا تھا جس میں طلباء فارسی، عربی، اردو، انگریزی پڑھتے تھے اسی زمانہ میں ظریف نے اپنے ہم عمر پڑوسی پنڈت

رتجن لال صاحب سے ہندی بھاشا اور سنسکرت پڑھی ۔ علمی صحبت اور ذاتی کتب بینی نے ظریف کی معلومات اور وسعت نظر میں اضافہ کیا ۔ حافظہ نے اس کو مستحضر رکھا ۔ مولانا صفی ایسے کامل استاد اور شفیق بھائی نے ظریف کی افتاد طبیعت پر نظر کر کے ظریفانہ اشعار کہنے کی مشق کرائی مگر اس طرح کی ظرافت جو طنز و مزاح کی حد تک مفید و نتیجہ خیز ہو، گویا دبائے بد مذاقی سے بچنے کے لئے شوگر کوٹڈ پلز (SUGAR COATED PILLS) کا کام دے اس سے مقصود یہ تھا کہ اس عہد کی شاعری میں جو سوقیانہ تبذل رنگ پیدا ہو گیا ہے اور اصلیت کی جگہ مبالغہ نے لے لی ہے نیز افراد قوم میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی اصلاح اس ظریفانہ کلام سے کی جائے اور ظرافت اس قسم کی شستہ اور مہذب ہو کہ اشعار بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں خواص و عوام کے سامنے پڑھے جا سکیں، جس کی ظرافت سے سب مسرور ہوں اور کلام تہذیب کے اندر رہے۔

ان کے نظم پڑھنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ تحت اللفظ پڑھتے ہیں لیکن بڑے مؤثر انداز میں، چہرے پر نہایت سنجیدگی کے آثار رہتے ہیں۔ یوں کہ پوری محفل پڑی لوٹ رہی ہے قہقہوں کے طوفان سے ساری مجلس گونج رہی ہے لیکن اس بندۂ خدا کے چہرے پر تبسم کا ذرا بھی اثر نہیں، ظریف نے اپنے اہل وطن کی

اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے اس ساز کو چھیڑا جس میں رنگینیت اور نغموں کے زیادہ دل کشی ہے جب زمانہ کے معالجین اخلاق ان مایوس العلاج مریضوں کو اچھا نہ کر سکے تو ظریف نے خشک پند اور تلخ نصائح کو ظرافت کے قند میں لپیٹ کر حلق کے نیچے اتار دیا۔ گدگدا گدگدا کر ہنسایا اور ہنسی ہنسی میں نشتر کی تیز نوک خراب ہونے والے زخم کے اندر اتار دی۔ ظریف نے ایک حاذق نباض کی طرح قوم اور ملک کے ہر سقم کو اچھی طرح پہچان لیا ظریف اصلاح عوام کی غرض سے ہر ایک شعبۂ حیات پر ایک گہری نظر ڈالتے ہیں (اور "عام انسانیت") کے سدھارنے کی غرض سے انسانوں پر ان کی کمزوریوں کو آئینہ بنا دیتے ہیں۔ ان کی بے لوث تنقید یہ پتہ دیتی ہے کہ ان کے دل میں ملک کا حقیقی درد ہے۔ ان کی بے باک نکتہ چینی صرف ادب و شاعری ہی تک محدود نہیں بلکہ وہ ملک کی تہذیب و شائستگی، اخلاق و طرز معاشرت پر بھی گہری نظر ڈالتے ہیں ان کی ہمہ گیر طبیعت ہر ضروری شعبۂ زندگی کو اپنی شاعری کا ایک دل چسپ موضوع بنا لیتی ہے مثلاً میونسپل الکشن پر انکی نظم ایک اچھا خاصا احتجاج سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے خلاف ہی نہیں ہے بلکہ ان قوانین سازوں کے بھی خلاف ہے، جنھوں نے ایسے ناقص اصولوں پر ضمام انتظام شہر ہر کس و ناکس کے حوالے کر دینے کے اصول بنائے، ظریف جس قسم کے انسان کا نقشہ پیش کرتے

ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے زندہ نظر آتی ہے۔ سیرت نگاری کا یہ کمال نظم کہنے والوں کو مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔

اکبر مرحوم نے ہم کو صرف تبسم کا موقعہ دیا تھا ظریف نے ہمکو اپنے اوپر قہقہے مار کر ہنسوایا۔ سُننے والے ظریف کے اشعار سُن کر بہ مشکل ہنسی ضبط کر سکتے ہیں ان کی ہر بات میں ایک بے ساختگی ہوتی ہے جو ان کی زبان سے نکل کر دل پر اثر کرتی ہے لیکن ہم کو اس دھوکے میں نہ رہنا چاہیئے کہ ظریف تھوڑی دیر کے لئے غم غلط کر دیتے ہیں بلکہ ذرا غور سے نظر ڈالنا چاہیئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ظرافت کے پیچھے درد کا اثر انگیز طوفان اُمڈا چلا آ رہا ہے اور خود اپنے قہقہے اپنے اوپر ہوتے ہیں۔]

ظریف :۔ (بہت سنجیدگی کے ساتھ) ملاحظہ ہو عرض کرتا ہوں۔ (تحت اللفظ)

میونسپلٹی اور میونسپل کمشنر

واہ بی میونسپلٹی جان کیا کہنا ترا — تو بھی لیلیٰ کی، عاشق تیرا مجنوں کا چچا
اپنی خودداری کو کھو کر جو ترا شیدا ہوا — بیخودی میں یہ زبانِ حال سے کہتے سُنا

بسکہ دیوانہ شدم عقلِ رسا درکار نیست
عاشقِ میونسپلٹی را حیا درکار نیست

تیرا خواہشمند ہر قبیدِ لیاقت سے بری — جسکا جی چاہے کھڑے اور لڑ کے لے لے ممبری
عہدِ آزادی نے ایسی ڈالدی ہے ابتری — اب تو ہر تانیث اور تذکیر میں ہے ہمسری

تجھکو کیا ! رنڈی ہو کوئی یا کہ رنڈی باز ہو

تیرا دروازہ کس و ناکس کے اوپر باز ہو

جمع کر دے قرض ہی لے کر ضمانت کے پچاس ‏ دور ہو جاتی ہے غیرت جب الکشن آئے پاس

ووٹروں کے ہاتھ جوڑے خوب ہو کر مدعا ‏ گڑگڑا کر ہر کس و ناکس سے یہ ہو التماس

رحم بچے کے عوض عسرت مری کم کیجئے

اپنے بچوں کا تصدق ووٹ ہم کو دیجئے

سنئے اک صاحب کا قصہ جب ہوئی شامت سوار ‏ یہ ضمانت کر کے داخل بن گئے امیدوار

چھوڑا پیشہ، ترک فرمایا جو کچھ تھا کاروبار ‏ کچھ اثاث البیت بیچا کچھ لیا سودی ادھار

مضطرب رہتے تھے یہ نام آوری کے واسطے

گھر سے نکلے ووٹ لینے ممبری کے واسطے

سب سے پہلے انکو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا ‏ شیخ بدھو نام تھا اور تھا جولاہا قوم کا

دھوتی باندھے مرزئی پہنے تھا وہ بیٹھا ہوا ‏ اک سڑا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا

جاتے ہی تسلیم کی جب اس کو با صد احترام

منھ کو ٹیڑھا کر کے بولا "کہو ہے ابا لیکم سلام"

بولے یہ پہلے نہ آیا میں ہوا اتنا قصور ‏ شیخ بدھو آپ مجھ پر رحم فرمائیں حضور

آپ کو والد کہا کرتے تھے "بھائی ابے دور" ‏ میں بھتیجا آپ کا ہوں اب ووٹ لے لوں گا ضرور

بولے بدھو "کا کہیو! ہم کہا کا ووٹ دے ای

ووٹ لیئے او جو ترتے ہم کا دس کا نوٹ دے ای

رام یہ معنا پیٹی ہے نہ جانے کیا بلا ‏ اور تم ممبر جو ہو تو ہم کا اچھا ہے دا

ہم کبھو اُنکا نہ دیکھیں اور نہ تمہرے باپ کا ‏ آوتے ہی آوت بنا لوئیں نہ کہ ہمکا پیچھا

ہو گیا ہشیار بڑھوا تم چلے ہو چوٹ دے اِی
کان پکڑا ہم نہ جائیے اب کبھو کا بوٹ دے اِی

ہم بھی نمیا پہ اک دن بیٹھ کے مُوتا جو را … کا کبھی ہو جھٹ دئی جا لالان ہم راہوئے گوا
جب کوئی ممبر نہ آیا اور نہ پوچھیں کا بھوا … ہم کچہری ماں جھگڑے سے اُجبر داری کیا
کمدما جھوٹا ہے صاحب ہم ہاں یہہ ہوتا نہیں
سچ کہی مینا سپٹی پر کبھو موتا نہیں

جب سرتے دار بولا لائے ہو کوئی او گواہ … ہم کہا سُسر اجاڈر وا کہس ہم کا تباہ
ہم جو لاہا آپ کے اور آپ ٹھہرے بادشاہ … کون کہہ کے سامنے موتت ہو؟ صاحب واہ واہ!
ہنس کے کہہ دیہیں جھگڑ بیکھوجی جاؤ بری
رہ گئی منھ بائے کے سب ممبرن کی ممبری

سن لیو ساری کتھا؟ دیکھو کہ ناہیں یہہ بتاؤ … بوٹ مانگے آئے ہو ہم سے تو کچھ ہم کا دلاؤ
سن جگن بکجو اس بھیّا! اب نہ ہم اموڑ کھاؤ … کہدیا بس کہہ دیا اب جاؤ چپ پے گھر کا جاؤ
جو کہ تم تم سے کہا سب پیشگی لیے لیب ہم
بوٹ دے موڑے سے چلیہو تو ہاں دے دیب ہم

جب میاں بدھو کے تیور اسقدر دیکھے کڑے … دہنے بائیں دیکھ جھٹ قدموں پہ آ کر گر پڑے
دل میں پچھتائے کہ آخر کیوں ہوئے تھے ہم کھڑے … کہئے ایسے جاہلوں سے کیا کوئی کشتی لڑے
آبرو کے ساتھ دے کر پانچ راضی کر لیا
کامیابی پر ہوئے خوش تاؤ مونچھوں پر دیا

دیہاں تک پڑھ کر ظریف چاہتے ہیں کہ ختم کر دیں لیکن اکبرؔ، برقؔ، چکبستؔ، حالیؔ

عزیز، اقبال، فانی اور دیگر ان کے احباب اصرار کرتے ہیں۔ ابھی اور پڑھیے ادھر فرحت اللہ، شبلی وغیرہ مصر ہیں کہ تمام محفل کی خواہش ہے لہذا چند بند اور ارشاد ہوں ہر شخص ایک ایک مصرعہ پر تعریف کر رہا ہے ہنسی اور قہقہوں کا طوفان ہے مگر ظریف کے چہرے پر تبسم تک کے آثار نہیں۔

سب کے اصرار سے ظریف پھر شروع کرتے ہیں۔

ظریف:۔ اچھا ملاحظہ ہو۔!

اس جگہ سے اٹھ کے گھر پر ایک صاحب کے گئے
دس برس ناکام رہنے پر ہوئے تھے جو بی اے
ریلوے میں تھے ملازم خود بھی تھے چلتے ہوئے
آپ کی تنخواہ تو کم، ٹھاٹھ تھے لیکن بڑے
انگلش اسٹائل پہ رہنے کا انھیں جو شوق تھا
بوٹ بے ایڑی پاؤں کی، کالر گلے کا طوق تھا
پھونس کے چھپر میں رہتے تھے یہ اک سامان سے
اور فرنیچر تو خارج ان کے تھا امکان سے
ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لے کر کسی دوکان سے
بیٹھتے تھے اس پہ چھپر میں نہایت شان سے
نام اک تختی پہ لکھ رکھا تھا یوں بھر کر ڈکار
مسٹر ابراہام، بی، اے، ٹی ٹی سی، ای آئی آر
دیکھ کر صورت کو ان کی اس طرح کہنے لگے

آئی ایم ویری بزی، میکا ہسیٹ، جلدی بولئے
پھر ادھر ٹہلے ادھر ٹہلے، گھڑی کو دیکھ کر

اپنے کتے سے کہا "کم سون" ان سے "گو اٹے"
پھر کہا "یو آر کنڈیڈیٹ بٹ نو بونڈ مین"

ٹم کو اپنا ووٹ ڈے گا کیسے صاحب؟ او لڈ مین با
چوں کہ کنڈیڈیٹ انگریزی سمجھتے ہی نہ تھے

گڑگڑا کر اس طرح صاحب سے فرمانے لگے
یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آپ پیدل جائیے

میں نے موٹر مانگ لی ہے آپ ہی کے واسطے
اور کیوں کر اس طرح چلئے گا مجکو دیتے ووٹ

کیجے پاکٹ بک پہ تاریخِ الکشن جلد نوٹ
بات انگریزی نما اردو میں یوں صاحب نے کی

ہم کہا انگلش میں ٹم سمجھا نہیں او آئی سی
ڈیکھو اپنی ووٹ رکھنی مانگٹا ہے ہم فری

کس کو ڈے گا پہلے بٹلائے نہیں سکٹا کبھی
ہام سٹی فادر نہیں ٹم کو بنانے مانگٹا

ڈیم! پھر موٹر پہ ہم کاہے کو جانے مانگٹا
ہو کے جب مایوس پلٹے یہ وہاں سے منہ پھلائے

دل میں کہتے تھے کہ اسکا ووٹ تو جاتا ہو ہائے

سال بھر پہلے بڑے دن میں جو ڈالی دے دو پائے

اب بجز اس کے کوئی صورت نہیں بنتی بنائے

فیس دے کر زس اک بھر سفارش لاؤں گا

چل گیا چکمہ تو ان سے ووٹ بھر لے جاؤں گا

(یہاں تک پڑھ کے باوجود اصرار ظریف نے ختم کر دیا) ہر ہر بند پہ تعریف ہو رہی ہے۔ اکبر، اقبال، چکبست، برق، سرور، شاد، عزیز، ثاقب تعریف کر رہے ہیں۔

آزاد، شبلی، فرحت اللہ سلامتِ زبان وخوبی بیان کی تعریف کرتے ہیں ظریف نے نظم تو ختم کر دی لیکن محفل بھر میں ایک تہلکہ مچا ہوا ہے، ہنسی اور قہقہوں کا طوفان رہا ہے اور ظریف خود خاموش ہیں۔ چہرے پر ہنسی اور تبسم کا نام نہیں۔ جب ہنسی کا سیلاب فرد ہو جاتا ہے۔

فرحت اللہ۔ (کھڑے ہو کر) جنابِ ظریف! ظرافت اور مزاح نگاری ایک مشکل فن ہے، الفاظ کی تلاش میں ذرا سی لغزش ہوئی اور سوقیانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، دونوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے بالکل ملی جلی ہوئی ہیں لیکن جناب آپ کے کلام میں جس متانت اور ادبیت کے ساتھ ظرافت کے مضامین نظم ہوئے ہیں اس کا جواب ملک بھر نہیں دے سکتا۔ آپ کی نظم کے کسی کردار نے کوئی ایسی بات کہی بھی تو آپ اس کی عریانی الفاظ کے لباس میں ڈھانک دیتے ہیں۔ " گویا مہذب لباس پہنا کر شہدے کو شریف بنا دیتے ہیں۔" آپ چونکہ ہر طبقے کو مخاطب

کرتے ہیں اس لئے آپ نے نہایت عام فہم اور شیریں زبان اختیار کی ہے ہر شعر روزمرہ کی صفائی اور خوبی بندش کا نمونہ ہے۔ اگر کہیں غیر زبان الفاظ استعمال کئے ہیں تو وہ اپنے محل پر ایسے مناسب ہیں کہ شعر کی رونق بڑھ گئی ہے، آپ نے غیر زبان کے الفاظ اپنی زبان سے کبھی استعمال نہیں کئے بلکہ جس طبقے کے انسانوں کا ذکر ہوتا ہے انھیں کی زبان سے ان کے حسب حال الفاظ انتخاب کر کے کہہ دیتے ہیں۔

ظریف :۔ مرزا صاحب! آپ کی جامع اور مانع تنقید کا شکریہ اور سب حضرات کا احسان کہ میری سمع خراشی کو ٹھنڈے دل سے سُنا، عالم اجسام میں میرے کلام کو سُن کر ہنسی تو سب کو خوب آتی تھی اور خوش بھی ہوتے تھے۔ مگر اصل مفہوم کو سمجھنے والے معدودے چند ہی ہوتے تھے خیر۔ مضیٰ ما مضیٰ۔

(یہ کہہ کر کنول ڈاکٹر اقبال کی طرف بڑھا دیتے ہیں)

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال ظریف کو سلام کر کے شمع لے لیتے ہیں اور اپنے آگے رکھ کر بیٹھے ہیں کہ سب کہتے ہیں۔

سب :۔ ڈاکٹر صاحب! ہم سب لوگ بہت مشتاق ہیں۔

اقبال :۔ داغ کی طرف دیکھ کے (اجازت لیتے ہیں)

داغ :۔ بسم اللہ اور آپ تو ترجمان حقیقت ہیں۔ سب کو اشتیاق ہے سُننے کا کچھ تو سنائیے۔

[ڈاکٹر سر محمد اقبال :۔ دورِ حاضر کے سب سے بڑے پولٹیکل شاعر د

"ترجمانِ حقیقت" ان کی ولادت ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں بمقام سیالکوٹ (پنجاب) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں پھر ایک مقامی مدرسہ میں ہوئی اس کے بعد انگریزی اسکول سے انٹرنس پاس کر کے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔اے اور لاہور کالج سے بی،اے کیا۔ پہلے اورنٹیل کالج میں پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے، ۱۹۰۵ء میں انگلینڈ گئے۔ فلسفہ میں ریسرچ (تحقیق) کی پی، ایچ، ڈی (P.H.D.) کر کے ۱۹۰۹ء میں بیرسٹر ہو کر واپس آ گئے۔

ان کو شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ داغ سے بذریعہ ڈاک اصلاح لیتے تھے جس سے زبان پر خاص اثر پڑا۔ صفائی بندش اور سلاست بیان داغ کی اصلاح کا فیض ہے۔" حکیمانہ بلند خیالی اور بالغ نظری کے واسطے غالب کی تقلید لازم تھی۔ چنانچہ غزلیں ایسی ہی ملیں گی جن میں غالب کے بلند خیالات، داغ کی حسین زبان میں مئے دوآتشہ کا لطف دیتی ہیں۔

ان کی قومی شاعری "انجمن حمایت الاسلام" لاہور کے سالانہ جلسے سے بعنوان "نالۂ یتیم" شروع ہوئی اور ان کی شہرت کے ایوان کا سنگ بنیاد بنی۔ "فریاد امت" "شکوہ" و "جواب شکوہ" بالترتیب اسی انجمن کے اجلاس ہائے سالانہ کا سرمایہ ہیں۔

قوم نے اقبال کو اور اقبال نے قوم کو خوب پہچان لیا۔

اسلام کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کے واسطے لوگوں کی

نظر انتخاب اقبال پر پڑی اور اقبال کے درد بھرے دل نے اپنی شاعری سے ایک نسخۂ شفا تیار کیا۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کے سدھارنے کے واسطے دو اجزا بہت ضروری سمجھے۔ (۱) ہمت افزائی (۲) خودداری جس کو اپنی مجوزہ دوا کے ہر ہر خوراک کے ساتھ مسلمانوں کی رگ و پے میں دوڑا دیا۔

ان کا پیغام "عمل" ہے ناامید ہو کر بیٹھ جانے والوں کو وہ برادرانہ شفقت کے ساتھ ڈھارس دے کر میدان عمل میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یورپ کی کورانہ تقلید سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغرب کی مادہ پرستی کے بجائے حق پرستی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اقبال نے "اخوت اسلامی" (PANISLAMISM) کے ذریعے مسلمانان عالم کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا۔ ان کے پیام کی طرح ان کی قدردانی فقط ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ ایران، افغانستان، ترکی، امریکہ، انگلینڈ تک ان کی شہرت کے بلند علم نصب ہیں۔ ان کے ہنر (ART) کو فقط پبلک ہی نے نہیں سراہا بلکہ حکومت برطانیہ نے بھی ان کو "سر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

انھیں نے فقط خیالات ہی کا اضافہ شاعری میں نہیں کیا بلکہ عمدہ تشبیہیں، دل پسند استعارے بھی پیدا کر گئے۔ فارسی ترکیبوں سے کلام میں زور پیدا کیا۔ کبھی کبھی ان کے الفاظ ذرا ثقیل بھی

ہوتے ہیں، مگر جب ان کے کلام میں سادگی پیدا ہو تو بہت زیادہ پُر لطف ہوتی ہے کہ جس سے ایک ایسا دلکش ترنم پیدا ہوتا ہے کہ جتنے "فنی سقم" ہیں سب کچھ دیر کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں

۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں دنیائے مجاز سے عالم حقیقت میں پناہ گزیں ہوئے۔

اقبال بلا ترنم مگر بہت خوش آیند) لحن میں پڑھتے ہیں۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر — مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

ان اشعار کی تعریف، غالب، ظریف، سرور، حالی، اکبر، برق، چکبست، فانی، شاد بے حد کرتے ہیں۔

اقبال کے سلام کر کے چپ ہو جانے پر حالی، چکبست، فانی نے فرمائش کی "ڈاکٹر صاحب چند بند شکوہ کے ارشاد ہوں"۔

اقبال:۔ شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو" دیکھئے چند بند اگر یاد آئے تو عرض کرتا ہوں (اپنی جیب میں دیر تک ڈھونڈھنے کے بعد کچھ کاغذ نکال کے) لیجئے چند بند تو مل گئے عرض کرتا ہوں۔

ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں

شکوہ (SHIKVA)

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہے فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محبوب تھی انساں کی نظر
مانتا بھی کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھکو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورہ میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوقِ خداوند کے پیکر کس نے
کاٹ کے رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے تازہ کیا پھر تذکرۂ یزداں کو

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجکو! کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

شکوہ سن کر یہ سب شاعر مثلاً داغ، امیر، ذوق، برق، حالی، چکبست، اکبر

شاد، ظریف، ریاض، عزیز، فانی تعریف کر رہے ہیں لیکن اگلے زمانے کے شعراء چیں بر جبیں ہیں۔ میر صاحب تو گویا متوجہ ہی نہ تھے، درد، سودا، ناسخ وغیرہ عروضی خصوصیات اور فنی تکمیل پر غور کر رہے ہیں، مصحفی نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "یہ خدا سے خطاب کر کے کہنا ٹھیک سی بات نہیں ہے"۔

محسن اور امیر مینائی نے کہا "بے شک میں یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ طرز شکایت کفر کی حد تک نہ پہونچ جائے۔

(شکوہ کے اشعار پڑھنے کے بعد محفل میں ایک جوش و ولولہ ہے ہر شخص ماضی کو گو آئینہ حال میں دیکھنے میں ایسا محو ہے کہ کلام میں عروضی اور فنی حسن و قبح پر نظر عموماً نہیں پڑتی ہے) ہاں جلال، ناسخ، تعشق وغیرہ اسی پر غور کر رہے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں کہ "واہ بھئی عہد آزادی میں شاعری بھی حدود قیود و اصول و قواعد سے آزاد ہو گئی کہ

مرزا فرحت اللہ بیگ :۔ (کھڑے ہو کر) کسے خبر تھی کہ غالب کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی فلسفی شاعر پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا۔ اردو کے کسی شاعر کو اس کی زندگی میں یہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کو ملی۔

اقبال فرحت اللہ کا شکریہ ادا کر کے شمع کا کنول فانی کی طرف کھسکا دیتے ہیں ڈاکٹر اقبال سے فانی کنول پا کر سلام کر کے لے تو لیتے ہیں۔

فانی :۔ (بہت پس و پیش کے عالم میں) بھلا اب کیوں کر کچھ پڑھوں؟

ڈاکٹر صاحب :۔ فانی صاحب! بسم اللہ کیجئے۔ میں نے چند بند شکوے کے

پڑھے ہیں کہ کسی کو شکایت نہ ہو، غزل کے میدان میں میں نے اسی واسطے قدم نہیں رکھا اور غزلیں میں نے کہی بھی بہت کم ہیں، آپ غزل پڑھیئے مسدس کو اس سے کیا تعلق؟ دوسرے یہ کہ یہاں کا تقدم و تاخر تو اس عالم میں وارد ہونے کی تاریخ سے شمار ہوتا ہے۔ بسم اللہ۔ بسم اللہ شروع کیجیے۔

مومن و غالب (اصرار کرتے ہیں) میاں شوکت علی پڑھو بھی۔

مومن:۔ ارے میاں تم حقیقی معنوں میں تلمیذ الرحمن ہو۔ تمھاری شاعری کسی استاد کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ تم تو اپنے پیش رؤں کے نقشِ قدم پر گامزن ہوتے ہو۔

فانی:۔ بہتر ہے عرض کرتا ہوں (غالب سے) گستاخی معاف۔

(ترنم سے)

غزل

آ، ورنہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں — دیکھوں الٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں

ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں

عہدِ خزاں میں رفتۂ آشوبِ ہوش ہوں — بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدمِ اولیں کے بعد — پھر راہ پر مجھے نہ ملا راہ بر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہوں — پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مایوسِ انتظار ہوں، مجنونِ اضطراب — ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا   شرح دراز زندگی مختصر کو میں

فانی دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈھ رہا ہوں اثر کو میں

پہلا۔ دوسرا شعر غالب کے رنگ اور زبان کا چربہ ہے ان کو بہت پسند آتا ہے۔ تیسرا شعر "رفتہ آشوب ہوش" اور "موسم دیوانہ گر" کی تعریف غالب و مومن بہت کرتے ہیں، چوتھا اور پانچواں شعر مومن کو پسند آتا ہے "بہت خوب کیسی بانکی بندش ہے۔" چھٹا شعر۔ میر صاحب سر ہلا دیتے ہیں ماشاء اللہ خوب کہا۔ ساتواں شعر غالب مسکراتے ہیں۔ بھئی خوب کہا ہے۔

فانی:۔ آنجناب سے کسب ضیا کی ہے۔ آٹھواں شعر میر صاحب پسند کرتے ہیں۔

مقطع:۔ میر صاحب، غالب، مومن تعریف کرتے ہیں" پھر پڑھو بالکل نئے طریقہ سے نظم کیا ہے۔

فانی سب کو سلام کرتے ہیں (کھڑے ہو کر) اور پھر بیٹھ کر شمع ثاقب کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

[**فانی**:۔ شوکت علی خاں نام، فانی تخلص "یاسیہ شاعری" کے پیشرو ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں بمقام بدایوں پیدا ہوئے، ان کے دادا شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ ان کی جائداد ایک سو چوراسی (۱۸۴) مواضعات پر مشتمل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جائداد ایسی تباہ ہوئی کہ ان کے والد محمد شجاعت علی خاں کو اپنی کوشش کی بنا پر پولیس انسپکٹری کی ملازمت کرنا پڑی یہ نوکری کو "غلامی" کہا

کرتے تھے۔ اسی واسطے بیٹے کو آزاد پیشہ وکالت کے واسطے تیار کرنا چاہتے تھے۔

فانی نے بدایوں کے اسکول سے انٹرنس پاس کیا۔ بریلی کالج سے بی، اے ہوئے علیگڈھ کالج سے ایل ایل بی کیا ان کو وکالت کے پیشہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اوائل عمر سے شاعری کا شوق تھا والد منع کرتے تھے یہ چھپاتے تھے۔ پہلی غزل ۱۸۹۰ء میں کہی کسی سے اصلاح نہیں لے سکتے تھے ۱۸۹۹ء میں فانی تخلص اختیار کر لیا ان کی زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں کی ایک پُرغم داستان ہے۔

ان کے کلام میں "میر کا یاس و حرماں حکیمانہ بالغ نظری بیک وقت موجود ہے۔" فانی غالب کے دماغ کا عکس اور میر کے دل کا مرقع ہیں۔" میر کا سوز، غالب کی رفعت نظر، مومن کا بانکپن ان کی غزل کا سرمایہ ہے۔ اسی کے ساتھ ذاتی تدبیر و تفکر۔ فطرت شاعرانہ اور جدت طراز طبیعت نے ان کی انفرادیت میں خصوصیت پیدا کر دی ہے (یہ کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔)
۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن میں انتقال کیا وہیں مدفون ہیں۔

شکل و لباس:۔ لمبے چہرے کے آدمی، سانولا رنگ، ستواں ناک۔ کلوں کی ہڈیاں آنکھوں کے نیچے کی طرف اٹھی ہوئی، رخساروں پر جھرّیاں، چہرہ پر حزن و ملال کا اثر، ڈاڑھی منڈی

ہوئی (OX FORD) آکسفورڈ فیشن کی مونچھیں۔

ہلکی شتری رنگ کی سرج کی شیروانی، علیگڈھ کٹ کا پائجامہ۔ کرسٹی کیپ سر پر۔

اب شمع ثاقب کی طرف بڑھتی ہے۔

فرحت اللہ (کھڑے ہو کر) " فانی صاحب آپ یاسیہ شاعری کے امام ہیں آپ نے شہنشاہ سخن حضرت میر کا حزن اور سہیل آسمان سخن حضرت غالب کا فلسفہ حکیم الشعراء حضرت مومن کے بانکے انداز بیان کو بیک وقت جمع کر دیا۔ آپ کا کلام غالب کے دماغ اور میر کے دل کا مرقع ہے۔

فانی تنقید کی تسلیم کر کے ثاقب سے کہتے ہیں "بسم اللہ۔"

ثاقب

مرزا ذاکر حسین قزلباش نام، ثاقب تخلص، وطن لکھنو، پیدائش آگرہ ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء جس سال غالب کا انتقال ہوا اسی سال یہ پیرو میر و غالب پیدا ہوئے۔

والد کا نام مولوی آغا محمد عسکری المعروف بہ مرزا محمد حسین قزلباش ثاقب مرحوم نے ۲۶ نومبر ۱۹۲۶ء مطابق ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ ہجری بعمر ۸۰ سال انتقال کیا۔

شکل و لباس:۔ نہایت گورے رنگ کے آدمی ہیں، متوسط قد اوسط درجہ کا جسم نہ بالکل دبلے پتلے نہ بہت موٹے، پیرانہ سالی کے آثار چہرے کی جھریوں سے نمودار ہیں، سر پر سفید بال خشخاشی۔ سفید ڈاڑھی دو

انچ سے کچھ زیادہ بڑی لیکن منقش کے پھولوں کی طرح بالکل صاف و سفید ویسی ہی مونچھیں مگر ہونٹ کا کنارہ کھلا ہوا۔ مونچھوں کے سرے داڑھی میں گھل مل گئے ہیں گرمیوں میں سفید دو پلی ٹوپی، جاڑوں میں سیاہ ایرانی دکرستی کیپ، حسب موسم عمدہ کپڑے کی شیروانی، اوسط درجہ کی مہری کا سفید پائجامہ، ہاتھ میں بڑی لکڑی متواضع خوش اخلاق، منکسر المزاج، علم مجلس کے بڑے ماہر، سادگی اور صفائی کے شائق اور عادی، تصنع اور بناوٹ کا ان میں ذرا نام نہ تھا۔

ثاقب نے فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی اور نہایت مکمل طریقہ پر اسے حاصل کیا انگریزی تعلیم زیادہ نہ کر سکے۔ د انگریزی میں (INTRANCE) اور عربی میں ابتدائی درسیات نکل چکے تھے، تلاش معاش میں لکھنؤ اور کلکتہ آتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں ریاست محمود آباد میں ہمیشہ کے واسطے ٹھکانا ہو گیا۔

ثاقب میر و غالب کے مقلد ہیں۔ ان کے کلام میں زبان کی صفائی مضمون کی تلاش میں پے در پے کوششیں ہیں اکثر و بیشتر کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے خیال کو کم سے کم سلیس و شیریں الفاظ میں جس سے افہام مفہوم ہو جائے نظم کر لینا ان کی خصوصیت ہے۔

"اگر انتخاب سے کام لیا ہوتا طرز بیان و استدلال کے لحاظ سے ثاقب لکھنؤ کے غالب ہوتے۔" شخصیت کو اتنا اہم بنا کہ انسان "انسان" معلوم ہو سکے اور اس کی ہستی اپنی انفرادیت کا دوسرے دل پر نقش

مترنم کر سکے ثاقب کے کلام کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے۔" (پروفیسر اعجاز حسین)

مرزا ثاقب نہایت انکسار کے ساتھ دکنول لے کر سلام کرتے ہیں ابھی انتظار میں ہیں کہ کچھ نہ کچھ شروع کریں کہ)

مرزا غالب:۔ میاں تم نے تو میری اور حضرت میرؔ کی پیروی کی ہے۔ بسم اللہ شروع کرو سوچتے کیا ہو؟

ثاقب میرؔ کی طرف دیکھتے ہیں۔

میرؔ صاحب:۔ ہاں بھئی ہاں سناؤ، دیکھیں تم نے ہماری پیروی میں کیا پایا وہی حسرت و یاس جس میں ہماری ساری عمر بیتی۔

ثاقب:۔ حضرات آپ تو فرما چکے ہیں۔

جانے کا نہیں شور مرے شعر کا ہرگز　　تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میرؔ:۔ بھئی تم بھی تو نام کی زندگی گذار رہے ہو۔

ثاقب:۔ استاد! آپ دونوں شاہان ملک سخن کی پیروی کے فیض سے یہی کیا کم ہے؟ کچھ دیر کے بعد ...... "عرض کرتا ہوں" ہر طرف سے بسم اللہ بسم اللہ۔

(ثاقب بلا ترنم کے غزل پڑھتے ہیں یا تحت اللفظ لیکن اپنے ہاتھوں کو حرکت میں لا کر مختلف جذبات اور تاثرات کا اظہار کرتے جاتے ہیں)

غزل

ہجر کی شب نالۂ دل، وہ صدا دینے لگے　　سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

آیئے! حالِ دلِ مجروح سنیئے! دیکھیئے　　کیا کہا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

سُننے والے رُو دیے سُنکر مریضِ غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صِلا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حُسن کا
کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں تا تب گھٹ رہا ہو وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

(مطلع پر میر، مصحفی، آتش، غالب، مومن، ذوق تعریف کرتے ہیں.

شعر (۲) مومن بھئی واہ! کیا ندرت ہے! کیا صفائی بندش ہے۔

شعر (۳) آتش۔ مصحفی، تعشق تعریف کرتے ہیں۔

شعر (۴) میر صاحب :- "واہ کیا! مضمون خوب ہے" غالب۔ "بہت صاف بندش"

ناسخ :- کس صفائی سے صنعت تقسیم صرف ہوئی ہے۔

شعر (۵) مومن :- بھئی ہم کو بہت پسند آیا بڑا اچھا انداز ہے۔

شعر (۶) سب تعریف کرتے ہیں۔

شعر (۷) پوری محفل پھڑک اٹھی، فلک شگاف تعریفیں ہو رہی ہیں ۔ مومن :-
"زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے" خوب کہا ہے۔ تعلقات دنیا کے رازوں کا آئینہ ہے بھئی ایک بار پڑھو۔

شعر (۸) غالب :- حقیقت میں میری سمجھا بیری اس شعر سے ثابت ہوتی ہے۔

مومن (غالب کی طرف دیکھ کر) "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" کے بعد اس سے بہتر صورت اس مضمون کی ممکن ہی نہ تھی، بھئی خوب کہا ہے۔

مقطع نمبر (۹) مومن (پھر تعریف کرتے ہوئے) ہمارے اس شعر سے بہت الگ کہا ہے "جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے"۔ خوب کہا ہے! واہ میاں حقیقت میں تم "پیرو میر غالب ہوا!"

ثاقب (سب کو سلام کرتے ہوئے) آپ لوگوں کا حسن سماعت ہے (کنول صفی کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔)

فرحت اللہ بیگ:- حضرت ثاقب! آپ جن کے پیرو ہیں ان لوگوں نے خود اور ان کے معاصرین نے اس امر کا اعتراف کر لیا۔ یہ آپ کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

نہایت نپے تلے ہوئے الفاظ، بہترین محاورات، شاعرانہ تیور کے ساتھ، نظم ہوئے ہیں واردات حسن و عشق کو لطیف اشاروں میں بیان کر دینا آپ ہی کا ایک کارنامہ ہے۔ "آپ انسان کو انسان بنا کر پیش کرتے ہیں۔"

ثاقب کے بعد شمع صفی کے پاس پہنچی ہے۔ صفی پڑھنے کو تیار ہیں کہ منشی جوالا پرشاد برق (صفی ان ہی کے اجلاس میں پیشکار تھے) کہتے ہیں۔

برق:- مولانا آپ کی غزل عرصہ دراز سے نہیں سنی کوئی غزل ارشاد فرمائیے۔

چکبست:- مولانا ہم سب کو آپ کی غزل ہی کا اشتیاق ہے۔

صفی:- میرا تو ارادہ تھا کہ کوئی نظم سناؤں، غزلیں تو بہت اچھی اچھی سنی گئیں مگر آپ کا حضرات کا اصرار ہے۔ بہتر ہے غزل عرض کرتا ہوں۔

صفی :- ولی سے اجازت لے کر نہایت مترنم طرز سے ہاتھوں کو مناسب طریقے سے بلند کر کے پڑھتے ہیں۔ یہ غزل میں نے دنیا سے اٹھنے سے چند روز پہلے کہی تھی اسوقت اسی کے چند اشعار عرض کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

غزل

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھُریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کئے

سادگی کی انتہا کر دی عنادلِ چمن
مدتوں رنگِ مزاج باغباں دیکھا کئے

ہم تھے اک آئینہ عبرت کسی کی بزم میں
مہرباں دیکھا کئے نا مہرباں دیکھا کئے

جب اسیر دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس
دور تک مڑ مڑ کے اپنا آشیاں دیکھا کئے

چشم ہمدردی صفی جن سے تھی وہ بیٹھے ہوئے
سیلِ خوں با افسوس آنکھوں سے رواں دیکھا کئے

شعرا صفی کے تمام ہم عصروں نے خوب تعریف کی، جرأت، آتش وغیرہ نے

شعر (۲) پر بیجبت پھڑک اٹھے فانیؔ اور غالبؔ نے بھی تعریف کی۔

(۳) تیسرے پر مومنؔ بہت زور سے تعریف کرتے ہیں۔

(۴) تمام اہل مشاعرہ اس شعر کی حسن بندش اور صنعت قطب کی تعریف کرتے ہیں۔

(۵) اس شعر پر غالبؔ بے اختیاری سے داد دیتے ہیں۔

(۶) اس شعر پر ان کے ہم عصر اور خاص طور سے میر تقی نے داد دی۔

(۷) مقطع پر میر مسکرائے، ناسخ، غالبؔ، اور ذوقؔ سب نے شاباش کیا۔

شبلی :۔ "مولانا! آپ بے شک، صاحب طرز ہیں۔ لکھنؤ اسکول کی شاعری کو آپ ہی نے

حقیقت میں سدھارا۔"

صفی سلام کر کے کنول آرزو کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

آرزو :۔ (صفی کا شکریہ ادا کر کے) مولانا آپ کے بعد میں کیا عرض کروں۔ معاف

کیجیے گا۔

صفی :۔ جناب اس میں کیا عذر خواہی کا موقعہ ہے میں جلدی چلا آیا، آپ سے پہلے

پڑھ دیا۔ آپ دیر میں آئے بعد کو پڑھیے۔

(جلال سے اجازت لے کر آرزو۔ خوش آیند لہجہ میں تحت اللفظ پڑھتے ہیں)

غزل

پھٹے دامن میں شرح حال، چشم خونفشاں رکھدی

ورق تھا ایک جس پہ لکھ کے ساری داستاں رکھدی

مٹا کر اس کے اک فقرے نے ساری داستاں رکھدی

کہ تاثیر سخن پر تہمت حسن بیاں رکھدی

نگاہِ گرم نے دعوائے جاں بازی پہ جھنجھلا کر
چھری جلتی ہوئی گردن پہ وقتِ امتحاں رکھدی

قفس سے ٹھوکریں کھاتی نظر جس نخل تک پہونچی
اسی پر لے کے اک تنکا بنائے آشیاں رکھدی

مبارک ہو نگاہِ یاس پہلی فتح کا سہرا!
چڑھی تیوری نے اک قاتل کی تھرا کر کماں رکھدی

سکونِ دل نہیں جس وقت سے اُس بزم میں آئے
ذرا سی چیز گھبراہٹ میں کیا جانے کہاں رکھدی

نگاہِ برق و چشمِ باغباں دونوں کی زد میں ہے
وہ گلبن جس پہ غفلت میں بنائے آشیاں رکھدی

کیا پھر تم نے رونا دیکھ کر دیدار کا وعدہ
پھر اک بہتے ہوئے پانی میں بنیادِ مکاں رکھدی

نہ ہے دستِ مژہ پر خونِ حسرت، اب نہ دامن پر
ملی تھی اک نشانی وہ بھی کیا جانے کہاں رکھدی

درِ دل آرزو دروازۂ کعبہ سے بہتر تھا
یہ او غفلت کے مارے تو نے پیشانی کہاں رکھدی

دونوں مطلع بہت پسند ہوئے، جلال نے بہت تعریف کی۔ شعر ۳۔ جرأت اور مومن کے رنگ کا تھا بہت پسند ہوا۔ شعر ۵۔ خاص لکھنؤ کے رنگ کا شعر تھا لکھنؤ اسکول کے تمام شاعروں نے اور داغ نے بہت تعریف کی۔ شعر ۶۔ جرأت

داغ، مومن، چکبست، رشید وغیرہ تعریف کرتے ہیں۔ شعر۷۔ حسرت، برق فانی، صفی وغیرہ تعریف کرتے ہیں۔ شعر ۸۔ داغ، جلال، برق، چکبست وغیرہ تعریف کرتے ہیں۔ شعر۹۔ "زبان کا بہترین شعر ہے۔" تمام زبان کے شیدائی کہتے ہیں۔ شعر۱۰۔ مقطع پر۔ مومن، پھڑک اٹھے، جلال، رشید، فانی چکبست سب نے تعریف کی۔ غزل بہت کامیاب رہی۔

فرحت اللہ:۔ آرزو صاحب! سبحان اللہ حقیقت میں آپ جانشین حضرت جلال ہیں۔ بندش کی صفائی خاص لکھنؤ کی زبان، سلاست بیان کیا کچھ نہیں ہے۔

جلال:۔ شاباش آرزو شاباش۔ شاعری میں جو میری آرزو تھی تم نے اس کو پورا کر دیا۔

آرزو فرحت اللہ کا شکریہ ادا کر کے جلال کو مؤدبانہ سلام کر کے بیٹھ جاتے ہیں پھر کھڑے ہو کر کنول بادشاہ (بہادر شاہ) کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

اب کنول ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سامنے ہے۔

آزاد:۔ حضرات! اب دور مشاعرہ اس مقام تک پہونچا ہے کہ "کلام الملوک و ملوک الکلام" سے آپ لوگ بہرہ یاب ہوں (دست بستہ) ارشاد عالی ہو۔

ظفر شاہ:۔ اماں رات بہت بھیگ گئی ہے۔ ہم کو کیوں پڑھواتے ہو۔ یہ سب کافی ہے۔

ذوق، غالب، تشنق، رنگین (اصرار کرتے ہیں) واہ حضرت ضرور ارشاد فرمائیے۔

واجد علیشاہ اختر:۔ بھائی صاحب ہمارے سر کی قسم آپ کو پڑھنا ہوگا۔ ہم کو عرصہ سے اشتیاق ہے۔ سیکڑوں برس بعد تو یہ موقعہ ملا ہے (دلی سے) حضرت آپ کی وجہ سے یہ موقع نصیب ہوا۔ آپ بھی فرمائیے تو بھائی صاحب کچھ ارشاد کریں۔

ولی:۔ ہمن کیں خوشی توں اسی میں اچھے کہ جہاں ہمن ایسوں کوں عزت افزائی فرمائی اچھے تہاں ریختہ بھی پڑھ کر ہمن کو خوشنود کریئے۔

ظفر شاہ:۔ بہتر (مسکرا کر) آپ کا اصرار میرے سر آنکھوں پر۔ کیا کہوں میری طبیعت میں غم و اندوہ ایسا رچ گیا ہے کہ یہاں بھی اس کا اثر اپنے آپ میں پاتا ہوں میں تو سمجھتا ہوں کہ ؎

درِ محفل خود راہ مدہ ہمچو منے راہ　　　افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

لیکن اگر آپ لوگ مغموم ہونا ہی چاہتے ہیں تو سنیئے۔

(بہت پُر درد مترنم لہجے میں) (سوہنی کا راگ)

غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا بخت مجھ سے بگڑ گیا، مرا وقت مجھ سے گذر گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سن کے کوئی کریگا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں

میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش

میں زمیں کے پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

مری قبر پہ کوئی آئے کیوں، کوئی لا کے شمع جلائے کیوں

کوئی چار پھول چڑھائے کیوں کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

نہ ظفر کسی کا رقیب ہوں، نہ ظفر کسی کا حبیب ہوں

جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں

مطلع۔ اختر شاہ بہت تعریف کرتے ہیں۔ رنگین، ذوق، دوبارہ پڑھواتے ہیں شعر (۲) ناسخ، داغ، غالب۔ شعر (۳) غالب، مومن، داغ، ذوق، شعر ۴۔ آتش، جلال، داغ، امیر، خوبی زبان کی تعریف کرتے ہیں۔ مقطع پر پوری محفل پھڑک اٹھتی ہے۔ سب ہی تعریف کرتے ہیں۔ کئی بار پڑھوایا جاتا ہے۔

ذوق مسکرا کر تعریف کرتے ہیں اور دل ہی دل میں مومن و غالب کی تعریفوں پر خوش بھی ہوتے ہیں کہ یہ اساتذہ بادشاہ کے شعر کی کلام ملوک ہونے کی وجہ سے نخواہ مخواہ تعریف کرنے والے نہیں ہیں۔ جب تک شعر اچھا نہ ہوگا سر تک نہ ہلائیں گے۔ ان کی تعریف اس کا ثبوت ہے کہ شعر شاعرانہ معیار پر بہت عمدہ ہے اس سے خوش ہیں کہ شعر تو میرے ہیں چاہے ظفر شاہ کی زبان ہی سے کیوں نہ ادا ہوں۔ حقیقت میں غزل ہی لاجواب ہے پھر عالم ارواح ہیں جہاں بادشاہ و فقیر دونوں برابر نہ کسی کو کسی کی مروت نہ کسی پر کسی کا دباؤ۔)

ظفر:۔ تعریف کرنے والوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

[سراج الدین محمد نام، بہادر شاہ خطاب، ظفر تخلص، ابوالمظفر کنیت

خاندان مغلیہ کے آخری شہنشاہ، ابن اکبر شاہ ثانی سنہ ۱۱۹۹ھ/۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے سنہ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۸ء تسلط بعد غدر معزول ہو کر رنگون ملک برہما جلا وطن کئے گئے۔ جہاں بعمر ۸۸ سال سنہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ آسمان سلطنت مغلیہ کا یہ آفتاب مشرق ہندوستان کے نقطۂ اول (رنگون) میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

بہادر شاہ مرحوم شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت شعر گوئی میں صرف کرتے تھے، آخری زمانہ میں جب شاہ شطرنج ہو کر رہ گئے تھے اور چوں کہ سلطنت کا کوئی کام نہ تھا تو یہی ایک مشغلہ رہ گیا تھا۔ ان کا دربار حقیقتہً شعر و سخن اور ادب و فنونِ لطیفہ کی ایک عظیم الشان بارگاہ تھی دراصل اس سے شاعری کو عروج ہوا۔

بادشاہ اپنا کلام استاد ذوقؔ اور مرزا غالبؔ کو دکھاتے تھے ان سے قبل شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کو شاعری کے ساتھ ہی ساتھ فن موسیقی میں کامل مہارت تھی۔ ان کی کہی ہوئی اکثر ٹھُمریاں ہندی میں بہت مقبول ہیں۔ یہ نہایت اعلیٰ خوش نویس تھے ان کی تصانیف:۔ شرح گلستاں سعدی، کلیات ظفرؔ (چار جلد) جنھیں تمام اصناف کلام موجود ہیں۔ ان کی غزلیں[1] اتنی مشہور ہوئیں کہ

[1] کہا جاتا ہو کہ دیوان ظفرؔ میں بہت سا کلام ذوقؔ اور کچھ کلام غالبؔ کا مدغم اور شامل ہو اس مبحث پر بہت زبردست دلیلیں موافق و مخالف نقادوں نے پیش کی ہیں لیکن اسمیں کوئی شک نہیں ہو کہ ظفرؔ کی غزلوں میں ان دونوں استادوں کا رنگ بہت چوکھا چڑھا ہوا ہے چاہے اصلاح کا اثر ہو یا شاہی کرامت۔

"ارباب نشاط" آجتک اکثر وہی گاتی ہیں۔

طرزِ کلام :- کلام بہت صاف و سادہ، اشعار بہت مزیدار، سلیس اور فصیح زبان۔ اُن مصائب کی اصلی تصویر دکھاتے ہیں جو ان پر گذرے ایک خاص درد و یاس کا اثر ہے۔ ظفر نے مشکل بحریں اختیار کیں، کچھ اتنی طویل کہ الفاظ بھرتے جاؤ اور ارکان مصرعہ ختم نہوں بعض ایسی مختصر کہ ردیف و قافیہ کے سوا دو ایک لفظ میں مصرع ختم ہو جائے۔ اس پر سخت ردیفیں جن کا میل قافیہ سے مشکل نظر آئے یا ایسے مشکل قافیے جو تعداد میں بھی کم اور ردیف سے دور بھاگنے والے جس طرح ان مشکلات میں یہ کامیاب رہے ہیں اسی طرح اکثر لزوم بالا یلزم میں عہدہ برا ہوئے ہیں۔ اس لئے بہت قابل تعریف کلام ہے، اکثر خیالات بلند ہیں، جذبات بھی ہیں، تشبیہیں رنگین اور متنوع۔]

غزل پڑھنے کے بعد حضرت ظفر (حسب عادت) ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ کوئی ملازم نظر آئے تو کنول نواب واجد علی شاہ اختر کی طرف بڑھایا جائے مگر یہاں (عالم ارواح) میں چوبدار وغیرہ کہاں، یہ حالت دیکھ کر شبلی جو ان کے پیچھے ہی بیٹھے ہیں کنول اختر شاہ کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

ظفر شاہ کنول میں ہاتھ لگاتے ہوئے کہتے ہیں۔

ظفر شاہ :- ہاں بھئی میں تو بھول ہی گیا تھا اب کنول ہمارے بھائی اختر شاہ کے سامنے جانا چاہیئے۔

بسم اللہ۔

اختر:۔ میری کیا مجال جو آپ کے بعد کچھ عرض کر دوں! یہ تو بڑی سوءِ ادبی ہو گی۔

ظفر:۔ واہ بھئی واہ یہ کون تکلف کا محل ہے۔ ارے بھائی صاحب یہاں کا تقدم و تاخر تو یہاں آنے کی ترتیب پر ہے۔ تم میرے بعد یہاں آئے ہو تو میرے بعد پڑھو بھی، اب سوءِ ادبی کا کیا خیال اور پھر یہ تو وہ مشاعرہ ہے پڑھو۔ میرے سر کی قسم پڑھو۔

اختر:۔ (شمع مل جانے کے بعد مجمع سے مخاطب ہو کر) کیوں صاحبو! ایک قطعہ بھی پڑھیں۔

تسنیم، آتش، امیر ضرور ارشاد ہو۔ سب کو اشتیاق ہے۔

اختر:۔ (بہت پر درد مترنم لہجے میں) سوہنی کے راگ میں۔

قطعہ

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بارِ خدا — پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت

ہاں وطن دیکھوں، تو شاداں ہو دلِ زارِ میرا — یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت

وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حبِ وطن — تنگیِ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہان جہاں پر بھی پڑا وقت مگر

ختم ہے اختر بےکس پہ جفائے غربت

شعرا۔ تمام شعراء لکھنؤ تعریف کر رہے ہیں (ناسخ، آتش، انیس، دبیر

نسیم، تعشق، امیر، حالی، جلال، برق، رشید، چکبست، عزیز، ثاقب

ر ۲۔ ناسخ نے بے حد تعریف کی۔[1]

ر ۳۔ مومن، غالب، ذوق، ظفر اور سب تعریف کرتے ہیں۔ مومن کہتے ہیں حضرت خوب فرمایا ہے ـــــ وسعت خلد اور تنگیٔ گور کے تضاد نے اس شعر کو "حب وطن از ملک سلیمان خوشتر" کی رباعی سے بڑھا دیا۔

ر ۴۔ ظفر شاہ بے حد تعریف کرتے ہیں، اہل لکھنؤ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

ر ۔ بھائی صاحب! یہ شعر تو ہم دونوں بدنصیبوں کے بالکل حسب حال ہے۔

اجد علیشاہ اختر :۔ (قطعہ پڑھنے کے بعد) اب غزل کی کیا ضرورت ہے؟

بلی :۔ واہ حضرت! غزل ضرور ارشاد ہو، ہم سب کو اشتیاق ہے۔

ختر شاہ :۔ بہتر (تھوڑی دیر گنگنا کر) گویا نشید نغمہ گو نشین کر رہے ہیں) (بہت خوش آیند ترنم سے) بھیرویں کے راگ میں

غزل[2]

ف رخسار پہ رہتی ہے پریشاں تاچند	دیکھ کے کھنچتا ہے طول شب ہجراں تاچند
کھئے بند رہے اب دیر زنداں تاچند	دل رہے خانۂ زنجیر میں نالاں تاچند
ب تک عمر بسر کیجئے صحرا میں یار	پھاڑیے جوش میں وحشت کے گریباں تاچند
یۂ وحشت دل اسکو بھی داماں کر دے	سوزن غم سے رفو ہوئے گریباں تاچند

۔ ناسخ کی ایک غزل اسی مضمون پر ہے مصرعہ "لکھنؤ مجھ پر فدا اور میں فدائے لکھنؤ"

۔ صبح ہو رہی ہے تو یہ غزل اسی مناسبت سے بھیرویں کے راگ میں پڑھی جاتی ہے۔

کبھی گلزار کی بھی سیر ہو آنکھوں کو نصیب — داغ تا چند، مرے دل کا یہ ساماں تا...

خاکِ ہند سے بھی چھوٹے گا یہ دیندار فراق — قید کافر میں رہے گا یہ مسلماں تا...

جانے دے جانے دے اب سکے نہ پیچھے پڑ یار

غم کشی عشق میں اے اختر نالاں تا چند

پہلے، تیسرے، چھٹے شعر پر سب اساتذہ تعریف کرتے ہیں " بہت خوب شعر کہا ہے " باقی اشعار پر بھی تعریف ہوتی ہے۔

سلطان عالم واجد علیشاہ اختر:- آخری تاجدار اودھ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے اپنے والد امجد علی شاہ مرحوم کے انتقال کے بعد بعمر بست سالگی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے " مبارک ہو شاہانہ تاج " (۱۲۶۲) تاریخ جلوس ہے ایام ولیعہدی میں " جان عالم " کہلاتے تھے، بعد تخت نشینی " سلطان عالم " لقب ہو گیا۔ فن تعمیر سے بے حد شوق تھا قیصر باغ ایک دنیاوی بہشت تھا جو دو کروڑ روپے میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اردو میں تمثیل کو اسٹیج کرنا ان ہی نے شروع کیا۔ مثنوی " غزالہ و ماہ پیکر " کو تصنیف کر کے اسٹیج کیا جس سے رہس کی بنیاد پڑی۔

۳۱ر جنوری ۱۸۵۶ وہ منحوس تاریخ تھی جب حضرت جان عالم سلطان عالم ہو کر کلکتہ گئے لکھنؤ کو جس کو " اختر نگر " کہتے تھے وداع کرتے وقت یہ شعر کہا تھا ؎

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دو سال کلکتہ کی نظر بندی کے مٹیا برج (GARDEN REACH) میں قیام کرنے کو ملا۔ مٹیا برج کو لکھنؤ کا ثانی بنا دیا۔ ویسی ہی عمارتیں بازاریں، کوٹھیاں، باغات بن گئے زندہ عجائب خانہ ہندوستان کیا بلکہ تمام ایشیا میں اپنا آپ نمونہ ہے۔

تمام اصناف فنون لطیفہ، عمارت سازی، سنگ تراشی، موسیقی مصوری، شاعری کا بے حد شوق بھی تھا اور کامل دستگاہ بھی رکھتے تھے۔ لکھنؤ سے کلکتہ تک کے سفر کا حال "مثنوی حزن اختر" میں نظم کیا ہے۔ اردو، ہندی، فارسی میں اشعار کہتے تھے، عربی سے کافی واقفیت تھی اشعار میں "اختر" تخلص تھا یہی ٹھمری، گیت، دادرہ میں "جان عالم پیا" ہو جاتا تھا۔ آخر کار کلکتہ ہی میں بعمر ساٹھ سال ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

(۱) تصانیف نظم :۔ چھ دیوان

(۱) شیوع فیض

(۲) قمر مضمون

(۳) سخن اشرف

(۴) گلدستۂ عاشقان

(۵) ماہ فلک

(۶) نظم ممبر

(۲) سات مثنویاں :۔ (۷) حزن اختر

(۸) خطابات محلات

(۹) بنی

(۱۰) تاجو

(۱۱) دلہن

(۱۲) فن موسیقی

(۱۳) دریائے تعشق

(۳) تین جلد مراثی:- (۱۴) دفتر غم ۲۵ مرثیے

(۱۵) بحر الم ۲۲ مرثیے } ۸۰ مرثیے

(۱۶) سرمایۂ ایمان ۳۳ مرثیے

(۴) دو جلد قصائد:- (۱۷) قصائد اردو — نعت و منقبت

(۱۸) قصائد فارسی — نعت و منقبت

(۲) تصانیف نثر:-

(۱) مباحثہ بین النفس و عقل — ETHICS

(۲) صحیفۂ سلطانی۔ — ادعیات جو پڑھتے تھے خود

(۳) نصائح اختری۔ — اخلاقیات — Moral Philosophy

(۴) عشق نامہ — تصوف — SOFISM

(۵) رسالہ ایمان — مصائب اہل بیتؑ

(۶) دفتر پریشان — انتشار

(۷) مقتل معتبر — صحیح واقعات شہادت حضرت امام حسین

(۸) دستور واجدی	سیاست مدن	CIVICS
(۹) صورت المبارک	علم معاشرت	SOCIOLOGY
(۱۰) ہیبت حیدری	غزوات حضرت علیؑ	
(۱۱) جواہر عروض	علم عروض	PROSODY
(۱۲) ارشاد خاقانی	معانی و بیان	REHTORIG

یہ کل ۴۲ کتابیں اپنے خاص مطبع میں چھاپ کر شایع کی تھیں۔ سوائے چند کے سب نایاب ہیں شاعری میں نواب میر مظفر علی خاں اسیر (شاگرد آتش) سے اصلاح لیتے تھے اور کبھی کبھی نواب فتح الدولہ برق سے اسیر محبت سرزمین وطن کے اسیر رہے ہاں برق نے کلی بن تک ساتھ دیا اور مٹیا برج میں جاکر زیر زمین پنہاں ہو گئے۔

طرز کلام :- وہی طرز جو اس وقت لکھنؤ میں رائج تھا یعنی رعایت لفظی کے ساتھ بندش مضامین۔ سوز و گداز کی کمی حزن اختر نے پورا کر دیا عیش و عشرت کی زندگی جب تھی تو اس کا ذکر کیوں نہ کرتے۔

انتزاع سلطنت کا غم نہایت پر تاثیر انداز میں کہتے ہیں۔ سلاست بیان، فصاحت کلام خوبی نظم و شیرینی زبان کی تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔]

(اختر کے پڑھنے کے بعد آزاد کھڑے ہوتے ہیں)

آزاد :- حضرات محفل مشاعرہ ختم ہوئی۔ شکر ہے کہ اس بزم کی افتتاح بادشاہ ملک معانی کے کلام سے ہوئی اور الحمد للہ بادشاہِ دنیا کے کلام پر خاتمہ ہوا

جس طرح اس طفل زبان کی پرورش سایۂ عاطفت ظلِ الٰہی میں عالمِ آب و گل میں ہوئی اس عالمِ ارواح میں شاعری اور زبان دانی کی پشت و پناہ کلامِ شاہانہ سے ہوئی بادشاہوں کا کلام حقیقت میں کلام الملوک ملوک الکلام کہے جانے کا مستحق ہے اس پر تنقید و تبصرہ کس کی مجال ہے۔

"عیاں را چہ بیاں؟"

اب اس درود کے بعد " دربارِ مدحِ رسول (صلعم) و آلِ رسول اکرام آراستہ ہوگا جس میں مداحینِ بارگاہِ رسالت نے اپنی اپنی کاوشوں سے جو جواہراتِ فکر فراہم کئے ہیں وہ پیش گاہ نبویؐ میں ہدیۂ پیش کر سکیں۔

(پردہ گرجاتا ہے)

سین ساتواں

محفل نعت

محسن کاکوری :۔

اب تک محفل مشاعرہ کی صورت یہ تھی کہ نیم دائرہ کی صورت میں سب بیٹھے تھے اور وسط محیط پر ولیؔ اور اخترؔ اور ظفرؔ اس طرح بیٹھے تھے کہ ان تینوں صدر نشینوں کی پشت مشرق کی طرف اور چہرے مغرب کی سمت اب صورت نشست یہ ہے کہ قوس تو وہی ہے مگر صدر کا قالین جنوب کی طرف بچھا ہوا ہے۔ اس پر ایک تخت ہے جس پر سفید فرش ہے اور ایک بہت عمدہ قلمکار سوزنی بچھی ہے یہ تخت وسط قالین پر بچھا ہوا ہے کہ ذاکر کا چہرہ شمال کی طرف اور پشت جنوب کی طرف ہو۔

قالین کے داہنے حصہ پر ظفر شاہ اختر شاہ اور شاہ ولی اللہ ان کے داہنی طرف میرؔ، سوداؔ، حسنؔ، دردؔ، بیٹھے ہیں۔ بالکل وسط میں تخت سے ملے ہوئے داہنی جانب انیسؔ اور بائیں جانب امیرؔ اور بیچ میں محسنؔ بیٹھے ہیں باقی جتنے شعراء ہیں وہ تین صفوں میں آگے پیچھے بیٹھے ہیں ان میں دردؔ اور جان صاحب دوش بدوش بیٹھے ہیں۔ مگر جانؔ صاحب اب مردانہ لباس پہنے ہیں۔ سفید انگرکھا، سفید دو پلی ٹوپی، بڑی بڑی چوڑی مہری کا پائجامہ سفید (کاکلیں اور زلفیں ان کے عہد کی وضع ہے وہ موجود ہیں) ولیؔ کے پیچھے شبلیؔ و آزاد بیٹھے ہیں اور غالبؔ کے پیچھے فرحت اللہ

(پردہ اٹھتا ہے)

سب لوگ ساکت و خاموش بیٹھے ہیں کہ ولی، شبلی کے کان میں کچھ کہتے ہیں۔

شبلی:۔ (کھڑے ہو کر) حضرت ولی اللہ کا حکم ہے جناب مولوی محمد محسن صاحب محسن کاکوروی اپنا قصیدہ لامیہ (نعت سرور عالم صلعم) میں ارشاد فرمائیں (دست بستہ محسن سے) بسم اللہ جناب محسن صاحب۔

حضرت محسن:۔ بہت خوب (اٹھتے ہیں اور تخت پر تشریف رکھتے ہیں، دیوان نعت کو جس پر ایک کاغذ بطور نشانی رکھا ہوا ہے۔ کھول کر، حضرت سودا کی طرف متوجہ ہو کر) معاف کیجئے گا! آپ کی زمین پر پائے قلم کو چلانا بڑی جسارت ہے لیکن میں نے اس کی تشبیب میں ہندی قوافی اسی واسطے استعمال کئے ہیں کہ آپ کے قصیدے سے کچھ نہ کچھ مباینت ہو جائے۔"

سودا:۔ واہ حضرت اس میں دفع دخل کا کیا موقع ہے میر نے بھی تو اسلاف ہی کا تتبع کیا ہے اور یہی قصیدہ میں لازم بھی ہے کہ تتبع اسلاف کیا جائے میں خود آپ کا متشکر ہوں کہ آپ نے مجکو اردو قصیدے گویوں کے اسلاف میں شمار کیا آجکل تو بزرگوں کی پیروی مذموم سمجھی جاتی ہے۔"

محسن:۔ "میں نے تو چودھویں صدی ہجری ہونے سے پہلے ہی دنیا کو ترک کر دیا تھا۔ میرے زمانے میں بھی تتبع اسلاف سعادت اخلاق تھی اب جو چاہے سو ہو یہ تو چودھویں صدی ہے۔" اللّٰھم صلّ علیٰ محمدٍ ..... الخ

تمام مجمع محسن کے ساتھ صلوٰۃ پڑھتا ہے۔

محسن شروع کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ (قصیدے کے لہجے میں نہایت خوش آیند

طرزیہ)

قصیدہ

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل | برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی | کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
آتشِ گل کا دھواں بام فلک تک پہونچا | جم گیا منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل
باغ میں ابر سیہ مست چڑھا کر آیا | جامِ خورشید مۂ میکدہ برجِ حمل
مئے گل رنگ ہے کیا شمع شب نکہت کا پھول | چلتے چلتے جو قلم ہاتھ سے جب آتا ہے نکل
گرتے پڑتے ہوئے دیوانہ کہاں کھا پاؤں | کہ تصور بھی وہاں جانہ سکے منھ کے بھل
یعنی اس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں | خرمنِ برق تجلی کا لقب ہے بادل
تار یاران مسلسل ہے ملائک کا درود | پئے تسبیح خدا وند جہاں عزوجل
کہیں طوبیٰ، کہیں کوثر کہیں فردوس بریں | کہیں بہتی ہوئی نہر لبن و نہر عسل
کہیں جبریل کی حکومت پہ کہیں اسرافیل | کہیں رضواں کا کہیں ساقیٔ کوثر کا عمل
کنز مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے | اک طرف مظہر قدرت کے عیاں شیش محل
باغ تنزیہ میں سر سبز نہالِ تشبیہ | انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفا ہیں کونپل
گل خوش رنگ رسولِ مدنی عربی | زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر | نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

منتخب نسخۂ وحدت کا یہ تھا روز ازل
کہ نہ احمد کا ہے ثانی نہ احد کا اول

شانہ حضرت کا ہے تشدید و دو لام دلیل | صاد ما زاغ بصر سرمۂ چشمِ اکحل

آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تا دمِ مرگ　　شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح　　ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں "بسم اللہ"

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

(اثنائے خواندگی میں تعریف کرنے والے یوں تو سبھی تھوڑی بہت تعریف کر رہے ہیں مگر اصل تعریف کرنے والے قصیدہ گو شعراء ہیں مثلاً :- سودا، مومن ذوق، غالب، امیر، جلال، شاد، عزیز، ثاقب)

ذوق :- (ختم قصیدہ پر) سید صاحب! لاجواب قصیدہ کہا ہے، نہایت پُر حاصل نہایت کامیاب استاد سودا کا قصیدہ لامیہ دیکھ کر میں نے اپنے لامیہ میں صورتِ قافیہ بدل کر " ی " کو روی بنا لیا۔

محسن :- جی ہاں! میں نے بڑی جسارت کی۔ استاد سودا کا لامیہ میرے پیش نگاہ تھا میں نے ہندی الفاظ کو قوافی بنانے کا گویا ایک لزوم مالا یلزم سا بنا لیا۔

ذوق :- اور ہندی الفاظ کو قافیہ بنانے میں میرے نزدیک تو کچھ اور مشکلات کا اضافہ ہی ہو گیا کیونکہ ہندی قوافی میں وقار قصیدہ کا باقی رکھنا اور بالخصوص جذالت کا برقرار رہنا جو قصیدہ کے لئے لازمی چیز ہے بہت دشوار ہے۔

محسن :- آپ کی قدر افزائی ہے، ورنہ کی میں نے بڑی جسارت

غالب :- اے حضرت! آپ کا یہ قصیدہ تو مقبول ہے مقبول

محسن :۔ (سلام کرتے ہیں)

سین ساتواں ________ پردہ گرجاتا ہے)

[محسن :۔ مولوی محمد محسن ابن مولوی محمد حسن بخش ابن مولوی حسین بخش شہید سید علوی، ان کے اجداد حجاز سے صحرام (خراسان کے قریب) میں آکر آباد ہوئے، قاری محمد صدیق۔ ہندوستان آئے اور عہد سکندر لودی میں قصبۂ کاکوری میں جاگیر دار ہوکر متوطن ہوئے۔

مولوی محمد محسن ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں بمقام کاکوری ضلع لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ۷ سال کی عمر سے اپنے دادا مولوی حسین بخش کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی، ۹ سال کی عمر سے شاعری شروع کردی مولوی ہادی علی اشک سے تلمذ حاصل کیا۔ مولوی عبدالرحیم سے تکمیل درسیات کی، کچھ دنوں عہدۂ نظارت پہ عدالت میں کام کیا، پھر وکالت ہائی کورٹ کا امتحان پاس کر لیا آگرہ میں پریکٹس کرتے تھے کہ متھرا کی منصفی گورنمنٹ کی طرف سے ملنے لگی مگر نوکری سے انکار کیا اور وکالت کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا عین غدر میں آگرہ سے کاکوری چلے آئے بعد ختم شورش غدر مین پوری میں کامیابی سے وکالت کرتے رہے تاآنکہ انتقال سے تین سال قبل پیشہ ترک کرکے گوشہ نشینی میں ریاضت اختیار کرلی آخر ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ

ؔ (۹) نو سال کی عمر سے شاعری کا شروع ہونا مبالغہ نہیں ہے بلکہ نقل ہے ان الفاظ کی جو محسن مرحوم کے صاحبزادے نے کلیات نعت مولوی محمد محسن مطبوعہ الناظر پریس صفحہ (۸) پہ درج کیا ہے ۱۲

مطابق ۲۴ر اپریل ۱۹۰۸ء کو اسہال کبدی میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام :- بدیہہ گوئی میں مشہور تھے۔ پیش پا افتادہ مضامین سے گریز کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تلمیحات کے بڑے شائق۔ شاعرانہ شوخی حدود تہذیب و متانت میں محدود رہتی تھی' انکی "بہار پسند طبیعت حسرت و یاس کے مضامین کی طرف راغب نہیں ہوتی"

بلندی مضامین، شکوہ الفاظ، چستی بندش ان کے قصید سے کا طرۂ امتیاز ہے۔]

سین آٹھواں

خاتمہ اور دعا

(بالکل وہی محفل ہے صرف فرق اتنا ہے کہ بجائے تخت کے ایک منبر پانچ سیڑھیوں کا نصب ہے، سفید پوشش چڑھی ہے اور وہی تلمکار سوزنی عرشۂ منبر کو چھوڑ کر چوتھی سیڑھی سے نیچے تک پڑی ہوئی ہے۔ منبر کے آگے قالین بچھا ہوا ہے، منبر کے ایک پہلو میں میر انیس دوسرے پہلو میں مرزا دبیر بیٹھے ہیں۔

صف اول میں قالین سے بالکل ملے ہوئے انیس کے سامنے رشید ایک سفید تولئے میں کچھ لپیٹے ہوئے (مرثیوں[1] کا بستہ) اپنے سامنے رکھے ہوئے نانا کے روبرو بیٹھے ہیں باقی سب لوگ اس طرح بیٹھے ہیں جس طرح ان کو ساتویں سین "محفل نعت" میں دیکھ چکے ہیں)

---

[1] مرثیہ کی اصطلاحی معنوں سے مراد وہ نظمیں ہیں جو واقعات کربلا کے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ عرب میں مرثیہ پہلے بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم نے اپنے فرزند کے قتل ہونے پر سریانی زبان میں پہلے پہل مرثیہ کہا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت ہی سے ایسی نظمیں عرب ہی میں عام طور سے رواج پانے لگیں اس کے بعد فارسی میں محتشم اور مقبل نے ایسی نظمیں شروع کیں اردو میں شروع شاعری سے مرثیہ کہے جانے کی ابتدا ہوئی۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتدا بھی مرثیہ سے ہوئی مگر یہ تو محقق ہے کہ قطب شاہی عہد میں اچھے خاصے مرثیہ دکن میں کہے جاتے تھے۔ پہلے بہت مختصر ہوتے تھے اور کوئی خاص صورت معین نہ تھی کبھی مربع، کبھی مخمس، کبھی قصیدے کی صورت میں صرف مضمون کے لحاظ سے انکو مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں سودا کے مرثیہ مشہور ہوئے (باقی صفحہ ۲۶۴ پر)

شبلی:۔ (کھڑے ہوکر) حضرات! اب فلک مرثیہ گوئی کے آفتاب و ماہتاب حضرت انیس و جناب دبیر اپنا اپنا کلام معجز نظام آپ لوگوں کو سنائیں گے۔ ان حضرات میں تقدم و تاخر کرنا ہم منتظمین کے فریضہ کے حدود سے باہر ہے یہ ظاہر ہے کہ ایک بزرگ سید آل رسول میں سے ہیں تو دوسرے بزرگ امتی ہیں، اگر آل رسول نے اہل امت کو اپنے نفوس مقدسہ پر ترجیح دی ہے تو اہل امت نے بھی ہمیشہ آل رسول کا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ اب (دونوں سے مخاطب ہوکر) آپ دونوں بزرگ آپس میں طے فرماکر شروع فرمائیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۳) اور حقیقتہً اسی عہد میں ان کی مقبول صورت مسدس کی ہو گئی جو اتنی پسندیدہ ہوئی کہ ابتک متواتر طور پر یہی رائج ہے، اسمیں شک نہیں کہ میر ضمیر شاگرد آتش نے فنی طور سے اسکی طرف توجہ کی۔ اسکے اجزا معین کئے جو آٹھ حصہ قرار پائے (۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ (۷) شہادت (۸) بین اس کے بعد لوگوں نے دو اجزا اور بڑھائے ایک ساقی نامہ دوسرا بہار مرثیہ نے اردو شاعری کی حدوں کو (حسن و عشق) وسیع کرکے محبت کے مختلف اقسام کو شامل کر لیا۔ مثلاً باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت۔ بھائی بہن کی محبت، شوہر و زوجہ کی الفت، چچا بھتیجے، ماموں بھانجے کی محبت، آقا اور غلام کا انس، جانوروں پر رحم، دوستوں کی شفقت وغیرہ۔ اس کے علاوہ منظر نگاری میں صبح شام کا منظر۔ دوپہر کی گرمی۔ دریا کی روانی۔ رزم کا نقشہ، بزم کے معاملات، میدان جنگ کی تصویر، گھوڑوں کا دوڑنا، الف ہونا، فوجوں کے دھاوے۔ تلواروں کی جھنکار پہلوانوں کا آپس میں تیغ آزمائی کرنا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نے اردو ادب میں آننا بڑا سرمایہ داخل کر دیا جس کی مثال عربی اور فارسی کے خزانوں میں ناممکن ہے اردو پہ فارسی کی تقلید کرنے کا کلیتاً الزام کہ اس زبان کے پاس عربی کے مندرس لباس کے سوا کیا ہے۔ مرثیہ نے زائل کر دیا اب اردو یہ فخر کہہ سکتی ہے کہ میرے دامن میں کچھ ایسے پھول بھی ہیں جو میری ہی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن کو معراج کمال تک پہونچا دیا اور حقیقت میں یہی موجد بھی تھے اور یہی خاتم بھی ہوئے ۱۲۔

(انیس اٹھنا چاہتے ہیں)

مرزا دبیر:۔ (انیس کا ہاتھ پکڑ کر) بھائی صاحب آپ سید ہیں۔ آپ کو مجھ پر شرف سیادت حاصل ہے۔ مجکو پیش خوانی کی اجازت دیجئے۔ میں آپ کے بعد نہیں پڑھوں گا۔

انیس:۔ بھائی صاحب! یہ تو خدمتِ دین ہے اس میں تقدم و تاخیر کا کیا سوال۔ میں آپ سے پہلے یہاں آیا مجھے پہلے پڑھ لینے دیجئے۔ آپ میرے بعد شوق سے پڑھیئے گا۔

دبیر:۔ بھائی صاحب! آپ کو اپنے "جد کے حق" کی قسم مجھ کو پہلے پڑھ لینے دیجئے۔

انیس:۔ "جد کے حق" نے مجبور کر دیا! بہتر ہے پہلے آپ ہی شرفِ ذکر آل رسول سے فیضیاب ہو جئے۔

(مرزا دبیر صاحب اُٹھتے ہیں، منبر کے قریب جاکر تیسری سیڑھی کو جس پر بیٹھیں گے بوسہ دیتے ہیں۔ پھر پہلے داہنا پاؤں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر پہلی سیڑھی پر رکھتے ہیں پھر دوسری، یہاں تک کہ تیسری سیڑھی پر دونوں پاؤں رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انگرکھے کے دامن برابر کرتے ہیں، منبر کے عرشے پر سے سفید تولیہ میں بندھا ہوا البتہ اٹھا لیتے ہیں۔ تولیہ کھول کر اپنے دونوں زانوؤں پر ڈال لیتے ہیں اس کے اندر اودے رومال میں لپٹے ہوئے بہت سے کاغذ ہیں۔ ان میں سے چند کاغذ نکال لیتے ہیں، باقی اسی رومال میں لپیٹ کر منبر کے عرشے پر رکھ دیتے ہیں، پھر درست ہو کر بیٹھتے ہیں۔

مرزا دبیر:۔ فاتحہ (خود بھی چپکے چپکے پڑھتے ہیں اور سامعین بھی پڑھ کر ہاتھ منھ پر پھیرتے ہیں)۔

رباعی

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے ہر شے ترے سجدے میں سرافگندہ ہے
کلمہ یہی توحید کا پڑھتا ہے دبیر جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

(چوتھے مصرعے کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں)

رباعی

ہم شان نجف نہ عرش انور ٹھہرا میزان میں یہ بھاری وہ سبک تر ٹھہرا
اس پلہ میں تھا نجف اور اس پلہ میں عرش پہنچا وہ فلک پہ یہ زمیں پر ٹھہرا

تمام استاد:۔ واہ واہ! کیا حسن تعلیل ہے! سبحان اللہ۔

(دبیر سلام کر کے چاہتے ہیں کہ مرثیہ شروع کریں کہ مجمع سے آواز آتی ہے کہ) چند شعر سلام کے ضرور ارشاد کیجئے۔

مرزا صاحب:۔ جناب عالی کہیں تاخیر واقع نہ ہو۔

چند آدمی:۔ نہیں حضرت تاخیر کیا ہو گی؟

مرزا صاحب:۔ بہتر، ملاحظہ ہو۔

ا؎ فاتحہ سے مراد سورۂ حمد (جس کو سورۂ فاتحہ کہتے ہیں) کی تلاوت۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے پڑھنے میں یہی فرق ہے کہ انیس اپنا کلام بغیر "فاتحہ" کے شروع کر دیتے ہیں اور دبیر فاتحہ پڑھ کر شروع کرتے ہیں۔ یہی فرق دونوں خاندانوں کے شاگردوں اور متوسلین میں اب تک باقی ہے۔

سلام

کون قائل تھا سلامی کہ جناں اور بھی ہے
کربلا دیکھ کے ہم سمجھے کہ ہاں اور بھی ہے

صدقے اس دل کے جو ہو حب علی سے آباد
اس سے بہتر کوئی دنیا میں مکاں اور بھی ہے

قطع فرماتے ہیں ہونٹوں سے عدو کا دعویٰ
پاس حضرت کے یہ تیغِ دو زباں اور بھی ہے

باغباں ہے تو بہشتوں کا بتا اے رضواں
قد اکبر کے سوا سرو رواں اور بھی ہے

شمر سے حُر نے کہا کیوں نہ غلامی میں کروں
غیر شبیر امام دو جہاں اور بھی ہے

طعنہ زن ہوتے ہیں جو منبر مجلس پہ دبیر
یہ نہیں دھیان کہ یاں مرثیہ خواں اور بھی ہے

(مطلع پر سب تعریف کرتے ہیں، شعر ۳۔ ردیف کے لگاؤ کا "بھی ہے" کے ساتھ معنویت بڑھانے کی تعریف۔ شعر ۴۔ کی سب غزل گو استاد تعریف کرتے ہیں)

(سلام پڑھ کر مرزا صاحب سلام اور رباعی کا کاغذ عرشہ پر رکھ دیتے ہیں) (اب مرثیہ شروع ہوتا ہے۔)

(دامن پھر درست کیے، ٹوپی کو ذرا جمایا، مرثیہ زانو پہ رکھ کر آستینیں

زرا زرا اچڑھائیں)

مرزا صاحب:۔ جناب قاسم ابن حسن کی جنگ کے چند بند عرض کرتا ہوں۔

مرثیہ

اعدا میں وصف ابن حسن کا بیان ہے　　　کہتے ہیں سب کہ صلِ علی کیا جوان ہے
رو آبروئے حُسن ہے قدرت کی شان ہے　　　اس آئینہ میں روئے حسن درمیان ہے

مردم جمالِ پاک پہ جب چشم وا کریں
آنکھیں اٹھا کے تیجۂ مژگاں دعا کریں

ناگاہ ابن سعد نے ارزق کو دی صدا　　　کیا دیکھتا ہے جا کے سر اس نوجواں کا لا
ہنس کر لگا وہ کہنے کہ شامت ہو میری کیا　　　لڑکے سے لڑ کے اپنی حقارت کروں بھلا

پیدا جو کی ہے آبرو اہل جدال سے
شو لڑکے کھوؤں اک زن بیوہ کے لال سے

یہ سُن کے اک پسر سے کہا جا تو اے دلیر　　　یاں دی صدا حسین نے ہاں اے حسن کے شیر
آیا وہ سو سوار لئے زندگی سے سیر　　　نوشہ سے بولا اب نہیں مرنے میں تیرے دیر

کر وار تیغ میان سے کاندھے سے ڈھال لے
لے پہلے اپنے دل کی تو حسرت نکال لے

یہ بولے ابن شیر الٰہی کا ہوں میں لال　　　بے زخم کھائے شیر دل کو آتا نہیں جلال
یہ سن کے اس نے تیغ علم کی پئے جدال　　　قربان تیز دستئ نوشاہ خوش خصال

قاتل کا ہاتھ اٹھے کا اٹھا ادھر رہا
اک ہاتھ میں نہ ہاتھ رہا اور نہ سر رہا

ارزق کے اور پسر نے کیا چست اپنا رخت — باندھی گمن کی شکل سپر اس نے ایک سخت
تھی وہ سیاہ مثلِ دلِ شمر اور کرخت — تیغ سفید لے کے چلا وہ سیاہ بخت

دل طنطنہ سے غصے سے سینہ بھرا ہوا
ہمراہ سو سواروں کا اس کے پرا ہوا

قاسم پہ اس نے حملہ کیا اور یہ کہا — مارا ہے چھوٹے بھائی کو تم نے مرے بھلا
قاسم نے کارِ تیغ رواں میان سے لیا — اک بار کہہ کے شیر نے یا شیرِ کبریا

مارا جو اس کی تیغ پہ خالی نیام کو
تیغِ گلی کی طرح سے توڑا حسام کو

ارزق یہاں برابر قاسم پہونچ گیا — وہ صرصرِ خزاں یہ گلِ باغِ مجتبیٰ
شیرانہ کھینچے ہاتھ میں شمشیر شعلہ زا — ارزق نے لی سپر صفت پشت اژدہا

قربان ضرب تیغ کے اور اس کمال کے
کیا کھیل تھا تیغ کا کہ کٹے پھول ڈھال کے

اس نے سپر کو پھینک دیا ہو کے خشمگیں — مطلع سے دیں کے مقطع ایماں ہو آفریں
گرزِ ثقیل لاتا تھا سر پہ وہ اہلِ کیں — بچ کر خفیف کرتا تھا اس کو یہ مہ جبیں

جوں قافیہ وہ فتح کی گو پیروی میں تھا
خطِ شکستِ مصرعۂ تیغِ علی میں تھا

قامت تھا اسکا بسکہ دراز و طویل و تر — تقطیع میں مشقت وافر پڑی نظر
آخر لگائی تیغ وہ نوشہ نے تول کر — مضموں اجل کا جسمیں توارد تھا سربسر

دو ٹکڑے ایک قد کے برابر تھے اس طرح
ایک شعر کے دو مصرعۂ موزوں ہیں جس طرح

اسات بند پڑھنے کے بعد مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"بس حضرات۔" برابر ہر بند پر تعریفیں ہوتی ہیں۔ آخری تین بندوں پر ناسخ، جلال، امیر، سرور وغیرہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ ٹکڑے ایک قد کے .... الخ

اس بیت کو دوبارہ پڑھ کے مرثیہ بند کرتے ہیں)

سب سامعین، التماس دعا!

(تھوڑی دیر کے بعد مرزا صاحب منبر پر سے اتر آتے ہیں)

[دبیر :- مرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص مرزا غلام حسین کے بیٹے۔ ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے لیکن بالکل صغر سنی میں اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ آ گئے جوان ہو کر مشاعروں میں جانے لگے ذوق سخن جب تیز ہوا تو خود بھی شعر کہنے لگے میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہو گئے دبیر نے یہی نہیں کیا کہ اپنی استاد کی بنائی ہوئی عمارت کو قائم رکھتے بلکہ بقول آزاد مرحوم جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند و روشن کر کے دکھایا جب شہرت کا ستارہ بلند ہوا تو دربار اودھ نے بھی سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا مرزا صاحب کے معتقدین یہ بات بہت فخر سے کہتے ہیں کہ مرزا صاحب بہت پرگو تھے کم از کم تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے رباعی اور سلام گویا باتیں تھیں جن کا کوئی شمار ہی نہیں بعمر ۷۳ سال ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء انتقال کیا اپنے مکان میں مدفون ہوئے (کوچہ مرزا دبیر وکٹوریہ اسٹریٹ نخاس لکھنؤ۔

طرز و خصوصیات :- کلام میں بہت زور جدت اور غریب

تشبیہیں عجیب عجیب استعارے عالمانہ زبان مغلق الفاظ مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ صنایع و بدایع بہ کوشش و زبردستی داخل کلام کرنے کی کوششیں بالکل نمایاں ہیں تفصیلات پر اتنا زور دیا کہ اختصار کی خوبی مفقود ہو گئی، پوری پوری روایتوں اور مکمل آیتوں اور حدیثوں پر کلام کی بنیاد رکھتے ہیں جس سے اتنا طول کلام بڑھا کہ شاعرانہ لطافت اور ذہنی کاوش کو بلند ہونے کا پورا موقع نہیں ملا بلکہ اصلیت سے بڑھ کر تصنع کی حد تک پہونچ گئی۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یکسانیت اور ہمواری کم ہے۔

ان کے زمانہ کے موافق زور دار مبالغے اور رعایت لفظی بہت ملیں گی۔ عالمانہ انداز بیان اور استادانہ رنگ میں نشست الفاظ سے ان کا کلام خالی ہے۔

[انیسؔ :- میر ببر علی نام، انیسؔ تخلص۔ میر مستحسن خلیقؔ کے بیٹے۔ انیسؔ کے دادا میر غلام حسن حسنؔ، مصنف، مثنوی سحر البیان تھے۔ حسنؔ کے والد میر غلام حسین ضاحکؔ تھے۔ فیض آباد میں سنہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے بہ عمر ۷۲ سال سنہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اپنے مکان کے قریب بغیچہ میں دفن ہوئے محلہ سبزی منڈی چوک، کوچہ میر انیسؔ۔

انیسؔ بذات خود معہ اپنے منجھلے بھائی میر نواب مونسؔ کے لکھنؤ اپنے والد کی حیات میں چلے آئے تھے ان کے والد میر خلیقؔ معہ اپنے چھوٹے بیٹے میر مہر علی انسؔ کے فیض آباد ہی میں رہے، خلیقؔ

کے انتقال کے بعد انس بھی لکھنؤ ہی میں آگئے اور یہاں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

انیس کا خاندان سالہا سال سے زبان کی خدمت کر رہا تھا ضاحک کے والد میر امامی اور ضاحک، خود مرثیہ (جو اس عہد میں رائج طرز تھا۔) کہتے تھے، حسن نے بھی مرثیہ کہا ہوگا مگر ان تینوں بزرگوں کے مرثیے وہی چند بند مربع یا مخمس کی صورت میں ہوتے تھے ضاحک مرزا رفیع سودا کے ہم عصر تھے جن کے زمانہ سے مرثیہ نے مسدس کی صورت پسند کر لی تھی چنانچہ میر انیس اپنے خاندانی مرثیہ گوئی کی بابت خود فرماتے ہیں۔

باپ مداح کا مداح تھا دادا مداح　　بھائی خوشگو پسر نیک عقیدہ مداح
جدّ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح　　اس ثنا گو کے بزرگوں میں تھے کیا کیا مداح

پھر ایک اور بند کی بیت میں فرماتے ہیں۔

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں　　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ان کے دادا میر ضاحک سودا کے ہم عصر ان کے دادا میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان (بے نظیر و بدر منیر) ان کے والد میر خلیق اس طرح انیس کو چوتھی پشت میں شاعری میراث میں ملی تھی۔

ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام

عہ (۱) ضاحک (۲) حسن (۳) خلیق (۴) انس (۵) نفیس یہ تھیں پانچ پشتیں۔ نفیس کے بیٹے (۶) عروج ان کے بیٹے فائز۔ (لا ولد انتقال کیا)

دنیائے اردو میں مستند سمجھی جاتی تھی۔ میر خلیق جب دلّی سے فیض آباد میں آئے تو شجاع الدولہ کی بیگم مشہور بخطاب ملکہ بہو بیگم صاحب "مرحومہ کی سرکار میں داروغہ محل ہو گئے چونکہ خود شاعر تھے زباں دانی کا شوق بھی تھا۔ اس لئے ایک بہت بڑی کتاب ساری بنا لی تھی جس میں اردو کے وہ محاورات اور روزمرہ لکھا کرتے تھے جو محل میں بولے جاتے تھے، گویا شاہی ٹکسال کے سب کامل عیار سکّے ان کے خزانہ میں جمع تھے۔

انیسؔ کی ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی صاحب سے ہوئی۔ شاعری میں باپ سے اصلاح لی۔ خلیقؔ مرثیہ گوئی میں ضمیرؔ کے ہم پلّہ وہم عصر تھے، جب دونوں باکمال اساتذہ دنیا سے گذر گئے تو دونوں کے ہونہار شاگردوں نے ان کی جگہ لے لی اور علم مرثیہ گوئی کو اپنے اسلاف سے بہت زیادہ بلند و برتر کر دکھایا۔

"انیس کو زبان پر وہ قدرت حاصل تھی جو خالق کو مخلوق پر ہے۔" انیسؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ بوڑھے، بچے، مرد، عورت، آقا خادم، دوست، دشمن کے جذبات کا ہر مرثیہ میں حفظ مراتب کے ساتھ خاص امتیاز اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ ان کے کردار کی بولتی چالتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت کے بیان میں دریا، پہاڑ، جنگل، ریگستان، صبح، شام، دوپہر، تاریک رات کا نقشہ یوں کھینچ دیتے ہیں کہ جس کا

پورا پورا اسماں آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔

رزم کے بیان میں :- تلواروں کا چلنا، نیزوں کا چمکنا۔ تبروں کی بارش گرزوں کی دھمک۔ گھوڑوں کا دوڑنا، حریفوں کے دست و بازو کی کی صفائی کا مرقع الفاظ میں ایسا کھینچ دیتے ہیں کہ پختہ کار سے پختہ کار مصور کا قلم (BRUSH) مہارت اس شکل کو ظاہر کرنے سے عاری ہے۔

بزم کی کیفیت یوں دکھاتے ہیں کہ گویا اسی میں شریک ہو کر تماشا دیکھ رہے ہیں۔

غرض کہ جس جس مضمون کو لیا ہے ایسا نباہا ہے کہ معلوم ہوتا ہو کہ یہی ان کا خاص رنگ ہے۔"

روانی و سلاست، و فصاحت انیس کے بیان قدم قدم پر ظاہر ہے کہ اور کوئی دوسرا اردو زبان میں اس امر خاص میں ان کا مثل بمشکل نظر آئے گا اور مشکل سے مشکل مقام اور دقیق سے دقیق مضمون کو انیس ایسے سہل الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں کہ مضمون کی دقت کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ مضمون اتنا دقیق اور الجھا ہوا تھا پھر ہر ہر لفظ متین اور سنجیدہ[1] ابتذال کا کلام بھر میں کہیں شائبہ بھی نہیں (یعنی ذلیل سے ذلیل لفظ کو اس طرح وارد کرتے ہیں کہ اس کا

---

[1] بہت سے ایسے مواقع مرثیے انیس میں ملیں گے جہاں بازاری الفاظ کو یوں وارد کیا ہے اور ایسی مہارت دکھائی ہے کہ ان کا ابتذال حسن بن گیا ہے (۱) آخر شغال تھا نہ دکھنے کی خو گئی خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی (۲) نوکری چھوڑی تو اتری ہوئی پاپوش ہے پھر۔

ابتذال اس خاص موقع پر حسن میں بدل ہو جاتا ہے) ...... شبلی

"زبان کی لطافت اور محاورات کی دلآویزی، مضمون کی دل کشی پڑھنے والے کی طبیعت کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی سیکڑوں بند مرثیے کے پڑھے چلے جاؤ ذرا طبیعت نہ اکتائے بلکہ اشتیاق مطالعہ بڑھتا جائے :.... آزاد

"ان باتوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں کہ ہر ایک رنگ کے مضمون ہر قسم کے خیال ہر ایک کے حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں تو رُلا دیں چاہیں تو ہنسا دیں اور اگر چاہیں تو حسرت کی مورت بنا دیں ..... آزاد

"منظر نگاری میں کوئی شاعر انیس کا مقابل نہ ہو سکا" شبلی

"اسی طرح سیرت نگاری بھی انیس کی ایک خصوصیت خاص ہے جس کا جواب نہیں۔ ہر شخص کی امتیازی خصوصیتیں موقع محل سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر ان کے تمام کلام پر نظر ڈالیں تو وقار و تمکین کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ کا آئینہ معلوم ہوتا ہے... اعجاز حسین

بہتر[۲] سال کی عمر میں ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء لکھنؤ میں اپنے ہی مکان میں انتقال

کیا اور اپنے ہی باغ واقع سبزی منڈی چوک میں دفن ہیں۔

(مرزا صاحب کے منبر پر سے اترنے اور اپنی جگہ بیٹھ جانے پر)

مولانا آزاد:- (کھڑے ہو کر اور انیس کی طرف اشارہ کر کے) بسم اللہ حضور!

آپ ہی کے اشتیاق میں لوگ بہت دُور سے آئے ہوئے ہیں۔

انیسؔ :۔ "بہت خوب! بسر و چشم (مسکرا کر) میرا کلام اس لائق کہاں کہ اس کا اشتیاق ہو مولا کا فیض ہے یہ آپ حضرات کا حُسن سماعت ہے جو میرا دل بڑھاتے ہیں ورنہ اتنے بڑے بڑے کامل استادانِ فن کے سامنے منھ کھولنا ایک جسارت ہے۔"

حسنؔ :۔ میاں ببر علی حضرت دبیؔ کے حکم کی تعمیل کرنا تمھارا فرض ہے۔

انیسؔ :۔ (دادا سے دست بستہ) سمعاً و طاعاً (اٹھتے ہیں اور منبر کی طرف جاتے ہیں)

سامعین[1] میں ایک جوش اور دل بستگی کی لہر پیدا ہو گئی ہے، ہر شخص اپنی اپنی جگہ سے کچھ کچھ آگے منبر کے قریب کھسک رہا ہے۔ انیسؔ منبر کے قریب جا کر بہت ادب سے تیسری سیڑھی کو پہلے بوسہ دیتے ہیں پھر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں (لب ہلتے معلوم ہوتے ہیں آواز نہیں سنائی دیتی) بہت اطمینان سے منبر پر زینہ بہ زینہ چڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں، اپنی ٹوپی کو برابر کرتے ہیں پھر رشید کی طرف دیکھتے ہیں رشید کھڑے ہو کر مرثیہ کا بستہ تولیہ میں لپٹا ہوا دونوں ہاتھوں پر رکھ کر آگے بڑھا دیتے ہیں۔ انیسؔ تولیہ کھول کر سبز ریشمی رومال میں کئی مرثیے اور چند ورق کاغذ جو لمبان میں دوہرے مڑے ہوئے ہیں الٹ پلٹ کر

---

[1] انیس کے پیش رو ان کے ادبی کارناموں سے ناواقف تھے ہاں ان کے زمانہ کے لوگ یا بعد والے جنھوں نے ان کو خود سنا تھا یا ان کا کلام پڑھا تھا ان کو بہت جوش شوق اور مسرت اس خیال سے پیدا ہے کہ اب پھر ان کو سنیں گے۔

چند ورق نکالتے ہیں۔ باقی لبتہ رشید کو دے دیتے ہیں۔ رشید لے کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

(انیس مرثیہ کے نیچے ایک بڑا سا سادہ کاغذ رکھے ہوئے ہیں مرثیہ پر سلام کا کاغذ اس پر رباعی کا کاغذ ہے)

انیس :۔ (کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے حسن کی طرف دیکھ رہے ہیں کچھ کہنے ہی کو ہیں کہ حسن درد کی طرف اشارہ کرتے ہیں)، (درد سے دست لبتہ) عرض کرتا ہوں قبلہ۔

درد :۔ بسم اللہ میاں ببر علی، ایک دو رباعیاں اور چند شعر کلام کے بھی پڑھنا۔

انیس :۔ بہت خوب (چپکے سے صلواۃ پڑھتے ہیں، ہونٹ ہلتے ہیں آواز نہیں نکلتی۔

طوفان حوادث کا تھپیڑا نہ رہا — کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیس — جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

ملاحظہ ہو :۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(تمام مجلس بھر تعریف کر رہی ہے بالخصوص سودا، درد، حسن، مصحفی میر صاحب۔

میر صاحب : بھئی کیا سچ بات کہی ہے۔

مصحفی :۔ کیا سچا ہوا اچھا مصرعہ ہے کہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔

انیس :۔ (دونوں بزرگوں کو سلام کر کے)

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے مُنھ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

(سب تعریف کرتے ہیں۔ میر سلاست زبان کی تعریف کرتے ہیں، مصحفی درد، سودا، حسن، مل کے پڑھتے ہیں) "میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے"

انیس :۔ (درد سے مخاطب ہو کر) اب چند شعر سلام کے ملاحظہ ہوں۔

درد :۔ بسم اللہ! بسم اللہ۔

سلام

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
کہاں مکاں سے اجل لے گئی مکینوں کو

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

یہ جھریاں نہیں، ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نظر میں پھرتی ہے وہ تیرگی، وہ تنہائی

لحد کی خاک ہے سرمہ مآل بینوں کو

بشر کو چاہیئے دنیا میں اس کے حسن سے عشق

کہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو

دہانِ کیسۂ زر بند رکھ یہ اے منعم!

خدا کے واسطے زاکر جبیں کی چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم

انیسؔ! ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

(پہلا مطلع میرؔ نے دوبارہ پڑھوایا۔ دوسرا مطلع۔ سوداؔ نے بہت پسند کیا اور دوبارہ پڑھوایا۔ تیسرا مطلع دردؔ کو پسند آیا، دوبارہ پڑھوایا، چوتھا شعر میر تقی میرؔ کو پسند آیا۔ شعر ۵ پر سوداؔ، آتشؔ اور مصحفیؔ بے حد خوش ہو رہے ہیں۔ شعر ۶۔ میر صاحب، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، شعر ۷۔ آتشؔ جلالؔ، امیرؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور سب۔ شعر ۸۔ دردؔ، میر تقی میرؔ، سوداؔ ولیؔ، مصحفیؔ، نسیمؔ، چکبستؔ، شعر ۹۔ محسنؔ، دبیرؔ، ثاقبؔ، شادؔ، ظریفؔ، ناسخؔ بہت پسند کرتے ہیں۔ مقطع پر بہت زور و شور کی تعریف ہوتی ہے "ہر دم" اور "ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو" کی تعریف زبان و محاورات بہت شد و مد سے ہوتی ہے۔)

انیسؔ صاحب۔ (سلام ختم کر کے رباعی اور سلام کا آغاز رشید کو دے دیتے ہیں، اب چند بند حضرت قاسم کی جنگ کے ملاحظہ ہوں۔

نیزہ بڑھا کے جانب قاسم بڑھا وہ یل دولھا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل

گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بھل — تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیشۂ اسد ذوالجلال کے
کیجو سنا کے وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکان — چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں — ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدھے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر — قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر — جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب — قبضہ میں لی کمان کیا ان پہ صد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب — تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّا اتر گیا

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد — تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیٔ حسد — کہتا تھا بازوئے شہ دیں یا علی مدد
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی خستہ تن پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال   جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسن کا لال
گھوڑے سے بس گرا دیا گھوڑا العبد جلال   اتنا بڑھے کہ اڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال

ادھر مڑ گئی یہ ہوش اڑے یہ خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پہ سمند کے

عباس نام دار نے پہلو سے دی صدا   "ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا"
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا"   سنتے ہی یہ فرس کو فرس سے جدا کیا

گھوڑا ابھی اس طرف سے ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا اکبر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

مرثیہ کے ہر ہر بند کیا ہر ہر مصرعے پر تعریفیں ہوتی ہیں۔

انیس اپنے بزرگوں کی تعریف پر مودبانہ سلام کرتے ہیں، اپنے ہم عصروں کو برابر کا سلام اور اپنے خردوں کی تعریف پر بہت شفقت سے مسکرا کے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

تیسرے بند کو پھر سے پڑھوایا گیا۔ (دوسرا مصرعہ بیت سے کیا مربوط ہے۔)

حسن، درد، سودا۔ نمبر ۵۔ ۶۔ ۷ بندوں کو پھر سے دوبارہ پڑھواتے ہیں)

ولی، میر۔ درد، سودا، مصحفی، حسن، ناسخ، آتش، نعش، دبیر جلال، داغ، امیر، نسیم، چکبست، برق، اکبر، شاد، رشید، مومن، غالب ذوق، ظریف، اقبال، ثاقب، سب بے حد تعریف کر رہے ہیں شور وغل

اور تعریف کا ہمہمہ بہت بلند ہے، اساتذہ الفاظ کی نشست کی تعریف کر رہے ہیں تخئیل اور حسن ادا کی تعریف شبلی اور آزاد کر رہے ہیں۔

آخری بند کے دو بار پڑھے جانے کے بعد

حسن:۔ ببر علی! حضرت (درد و میر) کا حکم ہے کہ اس بند کو پھر ایک بار پڑھو۔

انیس:۔ (دست بستہ) بہت خوب۔

عباس نامدار نے ....

....

مارا کمر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

(مجلس ختم ہوتے ہی انیس دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں)

اہلِ مجلس التماس دعا کرتے ہیں

انیس منبر پر دست دعا بلند کئے ہیں۔

ولی، میر، درد، سودا، حسن۔ سب کے سب دست دعا بلند کئے ہوئے ہیں۔

دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ

پردہ گر جاتا ہے۔

ختم شد

APPENDIX & TIME CHART WITH SEATING ARRENGEMENT

ضمیمہ جات

(مع)

ٹائم چارٹ

(و)

خاکہ نشست

ضمیمہ اوّل (الف)

اصنافِ کلام

۱۔ غزل :-

غزل میں تغزل ضروری چیز ہے اور تغزل کے معنی لغت میں عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کرنا، یہ خیال کرنا کہ عملاً اس تعریف پر شعراء کاربند بھی ہوئے یا نہیں بالکل عبث ہے حقیقت میں شاعر دنیائے تصور و تخیل کا باشندہ ہے وہ اپنے خیال میں جس دل ستاں سے باتیں کرتا ہے وہ اس کا محبوب و معشوق ہی ہوتا ہے، اس تعریف میں "عورت، کو اس کے لغوی مفہوم میں نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ لفظ محبوب و معشوق کا مترادف خیال کرنا مناسب ہے، حقیقت میں غزل عشقیہ (رومان) شاعری کی واحد جولانگاہ ہے جس میں "محبوب" و "معشوق" سے خطاب بھی کرتے ہیں اور اس کو غائب یا حاضر مان کر اس کی بابت گفتگو و کلام بھی کرتے ہیں۔

شاعری کے تمام اصناف میں غزل سے بلند تر کوئی چیز نہیں۔ بقول بعض عروضین "شاعری کی ابتدا بھی غزل ہے وسط بھی غزل ہے اور انتہائی اوجِ کمال بھی غزل ہی ہے" غزل ہی کی مشق سے زبان پر قدرت حسن بیان کی مہارت، صحیح محاکات کی طاقت اور پر اثر تخیئل کی قوت پیدا ہوتی ہے، تمام اصنافِ کلام پر قابو اسی غزل کی مشق سے حاصل ہوتا ہے۔ غزل کی قوت گویا بجلی کی طاقت کا خزانہ ہے جس سے فقط روشنی ہی نہیں

ہو سکتی بلکہ تمام ضروریات زندگی باحسن اسلوب پورے ہوتے ہیں۔

قلب کی گہرائیوں اور روح کی بلندیوں سے باخبر کرنے والی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہے یعنی وہ علوئے فطرت اور عروج روحانیت جہاں تک استعلائے تصور انسانی ہو سکتا ہے یا یوں سمجھئے کہ یہی معراج تصور انسانی ہے جہاں آدمی مادیت کے محدود دائرے سے گزر کر اپنے مرکز اصلی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے یہاں تمام دنیاوی امتیازات کو (جس میں مذہب بھی شامل ہے) محو کر دیتا ہے انھیں اگر کوئی شخص خوش قسمتی سے "فطرتاً شاعر" ہوا تو وہ منزل اول ہی پر شاہد حقیقی کے جلوے کی جھلکیاں دیکھ لیتا ہے اور اس نغمۂ سرمدی کو سن لیتا ہے جو دنیاوی زیر و بم میں مشغول رہنے والوں کی حد سماعت سے باہر ہے۔

اسی کی لذت اس کو بے خود رکھتی ہے۔ دل کے کان اور قلب کی آنکھیں اور جلوے دیکھتی اور نغمے سنتی رہتی ہیں۔ دنیاوی زمزمے اور مادی شکلیں سماعت و بصارت پر اثر نہیں ڈالتیں۔

اس محبت و عشق کا سوز و گداز اس پر ایسا اثر کرتا ہے کہ وہ اسی کا ذکر کرتا ہے۔ اسی فکر میں رہتا ہے "محبت" اس کی دنیا ہے یہی اس کا ماحول ہے یہی اسکی منزل ہے یہی اس کی راہ ہے۔ یہی اس کی تمنا ہے، یہی اس کی امید گاہ ہے، یہی اس کی آرزو ہے۔ اسی کے نقطۂ علی علیئین پر پہونچنا اسی سمندر میں ڈوب کر فنا ہو جانا اس کا مقصد حیات و ممات ہوتا ہے۔

اسی محبت کے درد سے تاثیر پیدا ہوتی ہے اور اسی تاثیر سے دوسرے دل

کو متاثر کرتا ہے بیان میں عذوبت، زبان میں حلاوت بھی اسی اثر سے ہوتی ہے جس کو حقیقت اور صدق اور روشن کر دیتا ہے۔ یہ بات صرف فطرت کی طرف سے "ودیعت" ہوتی ہے۔ کوشش سے جو حاصل ہوتی ہے وہ اتنی پرکار نہیں ہوتی، مصنوعی ہی رہتی ہے۔

غزل علم النفس کے مسائل ہی نہیں بلکہ جذبات گوناگوں کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ یہی ایک ایسی صنف نظم ہے جو واردات قلبی اور امور ذہنی کے اظہار کا آلہ کار ہے بشرطیکہ شاعر کو سلیقہ ہو اور ڈھنگ آتا ہو۔ یہ داخلی شاعری ہے خارجی واقعات کے شمول سے غزل غزل کے دائرہ سے خارج ہو جاتی ہے۔

اُردو کی غزل انگریزی "سانٹ" (SONNET) سے بہت مشابہ ہے اور اسی طرح چند قواعد وضوابط کو ملحوظ رکھنا اس میں بھی لازم قرار دیا گیا ہے مثلاً اول شعر جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف وقافیہ ہوتا ہے مطلع کہلاتا ہے۔ غزل کے تمام اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ اور ردیف ہونا چاہیئے تسلسل مضمون غزل میں ضروری نہیں بلکہ ایک حد تک نامناسب ہی خیال کیا جاتا ہے جب تک کہ شاعر اس کا التزام (بطور لزوم مالایلزم) نہ کرے (جو بہت کم شعراء نے شاذ ونادر طور پر فارسی اور اردو میں کیا ہے) اردو میں مسلسل غزل کلام حضرت صفیؔ مدظلہ میں ملتی ہے اور جناب اثرؔ صاحب دام اقبالہ بھی بہت عمدہ مسلسل غزل فرماتے ہیں۔

غزل کے اشعار عموماً طاق ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ تیرہ ہوتی ہے لیکن بعض کے نزدیک ۱۵ اور ۱۹ تک ہو سکتے

ہیں۔ غزل کے آخر کا شعر جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کا رواج شاعری میں شروع زمانہ شعر گوئی سے آج تک پایا جاتا ہے۔ اس صنف کو اگلے زمانے سے اس وقت تک برابر کامیابی حاصل ہے۔ نازک خیال شاعروں نے غزل کو گوناگوں مضامین کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ غزل کے واسطے کسی خاص بحر کا تعین نہیں ہے، یہ بحر میں کامیابی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔

۲۔ ریختی :۔

غزل ہی کی ایک شکل ہے۔ یعنی عشق و محبت کے جذبات جو انسان میں فطرتاً ودیعت ہیں وہ عورت اور مرد دونوں میں یکساں ہیں، یہ اور بات ہے کہ سوسائٹی اور حلقہ اصول تہذیب اس کے اظہار میں صرف ایک ہی جنس پر بندشیں ڈال دے۔ غزل عربی لفظ ہے، یہ عرب سے عجم اور ایران سے ہندوستان میں آئی، عرب کا مذاق شاعری بھی یہی ہے کہ مرد عاشق اور عورت معشوقہ ہو لیکن ہندوستان کی ہندی شاعری کو اگر بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو اس کے برخلاف رنگ ہے۔ یعنی عورت عاشق اور مرد معشوق اسی جذبہ کے ماتحت شعرائے اردو نے یہ خیال کیا کہ آخر عورتوں کو بھی اپنے جذبات کے اظہار کا موقع کیوں نہ دیا جائے اور جب وہ بھی زبان رکھتی ہیں تو کیوں ساکت و صامت مویشیوں (DUM DRIVEN CATTLE) کی طرح ان کو رکھا جائے۔ لہٰذا انھوں نے مخصوص محاورات و مرکبات و الفاظ اور وہ روزمرہ عورتوں کی زبان پر رائج تھے انھیں کو صرف کرکے بزبان نسواں

غزل کے اشعار نظم کئے۔

چونکہ صدر شاعری کے اردو گو شعرا اردو شعر کو ریختہ کہا کرتے تھے اور عموماً تانیث اسماء اردو میں "ی" سے بناتے تھے اس واسطے شعر منسوب بہ نسواں کے واسطے بجائے ریختہ کے "ریختی" کے لفظ کا استعمال ہونے لگا۔

بعض مؤرخین نے سعادت یار خاں رنگینؔ کو اس صنف کا موجد تسلیم کیا ہے لیکن دیگر مؤرخین مثلاً قادر بخش صابرؔ رنگینؔ کے متعلق فرماتے ہیں"۔ یہ ادعائے محض ہے اس واسطے کہ انشاء سے پہلے ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور تھیں۔

"تذکرۂ گلستانِ سخن" زبان اردو میں اول اول ریختی کو رواج انشاء اللہ خاں انشاء نے دیا اور اس کے بعد سعادت یار خاں رنگینؔ نے اب اس زمانہ میں میر یار علی جانؔ نے کمال جانکاہی کی اور اس نظم کی مشق حدِ کمال تک پہونچا ئی"۔

تذکرۂ مہر جہاں تاب میں بھی انشاء کو ریختی کا موجد تسلیم کیا ہے اور ان کے بعد ان کے اول پیرؤں میں سعادت یار خاں رنگینؔ ہیں۔

صاحب شعر الہند بجذ مولویت و از راہ تقدس ریختی کو غیر مہذب اور شائستگی سے دور تصور فرماتے ہیں مولانائے موصوف نہیں معلوم کون شرعی توجیہہ اس کے غیر مہذب و شائستہ ہونے پر متصور کئے ہوئے ہیں جو اس قدر برخاستہ خاطر ہیں۔ حالانکہ ہر ایک ادب کے طالب علم اور زبان کے محقق کی نگاہ میں اس کی بہت اہمیت ہے تمام ادیب اور شاعر اسمیں متفق الرائے

ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ جس حد تک عورتوں کی زبان و محاورات، اصطلاحات اور مراسم وغیرہ کا تعلق ہے ریختی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جان صاحب کے دیوان ریختی کے بہت سے الفاظ جو مخصوص عورتوں کی اصطلاح و رسوم سے متعلق ہیں ہمارے ملک کے بہت سے زبان داں کما حقہ سمجھ نہیں سکتے، حالانکہ صحیح زبان داں وہی ہے جو ہر طبقہ کے لوگوں کی زبان سے واقف ہی نہو بلکہ ایک دوسرے سے امتیاز کر سکے امیر خسروؒ نے اپنے مؤلفات میں نواح دہلی بھٹیاریوں کی فحش زبانؒ تک سے واقفیت کا اظہار کیا ہے اور حقیقتہً یہ واقفیت قابل ستائش ہے اس واسطے کہ کسی چیز کا علم اس کے جہل سے بہرحال بہتر ہے اس کو برتنا یا اس پر عمل نہ کرنا دوسری چیز ہے۔

بہرحال اس صنف کلام میں انشاؔ، رنگینؔ اور جانؔ صاحب بہت مشہور ہیں اس تمثیل میں رنگینؔ اور جانؔ صاحب جو پڑھیں گے وہ ریختی ہے اور اس کے پڑھنے کے خاص اصول و طرز و لباس ہیں، اسی اصول، اسی طرز اور اسی لباس میں یہ دونوں ریختی کے استاد اپنا کمال دکھائیں گے۔

۳۔ مستزاد:۔

لفظی معنی "جس میں کچھ زیادہ کر دیا گیا ہو" یعنی اضافہ شدہ" یہ وہ صنف نظم ہے کہ اس کے ہر مصرعے یا بیت کے آخر میں نثر مسجع لگا دیں اور یہ فقرہ نثر مسجع کا ایسا ہو کہ سابق کلام کے ساتھ تعلق رکھے اور اس مصرعے یا بیت کو جس کے آگے لگایا گیا ہے اور چمکا دے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ شعر یا

مصرع کے معنی بغیر اس کے ناتمام رہیں اور حقیقت میں یہ ایک مشکل چیز ہے۔ اس واسطے کہ غزل کے مصرعے کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے جو الفاظ ضمیمہ دری تھے وہ صرف کر کے مصرع کے معنی مکمل کر دئے گئے اب اس فقرہ نثر مسجع سے وہ معنی اور زیادہ روشن ہو جانا چاہیئے اور اگر یہ فقرہ (نثر مسجع) کا نہ بھی ہو جب بھی اسکے معنی پورے ہی سمجھے جائیں اضافہ سے بے جا طوالت بھی نہ ہو۔

اس مشاعرے میں جرآءت جو پڑھیں گے وہ مستزاد ہے، جرأت نے اس صنف میں بہت جرأت کی ہے اور کئی مستزاد ان کے کلیات میں ہیں۔

۴۔ قصیدہ۔

لغوی معنی گاڑھے مغز یا گوشت پُر مغز کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں اشعار پر معنی یا اشعار پاکیزہ کے ہیں اور وہ بھی غزل کے اسلوب پر۔ لیکن شمار میں غزل سے زیادہ یعنی بقول غلام علی آزاد (صاحب آتش کدہ) کم از کم اکیس اور زیادہ کی تعداد ستر تک ہے۔ بلکہ زیادتی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔ مگر فارسی اور اردو کے بعض شعراء نے دو سو شعر تک کہے ہیں۔ اہل عرب کے بعض قصائد میں پانچ سو شعر تک دیکھے گئے۔ ع

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

یہ بھی دستور ہے کہ قصیدہ اپنے قافیہ کے آخری حرف سے موسوم ہوتا ہے۔ مثلاً آخر میں اگر لام ہے تو لامیہ، میم ہے تو میمیہ اور اگر دال ہے تو دالیہ وغیرہ۔ چنانچہ یہاں جو قصیدہ مولوی محمد محسن صاحب کا کوروی پڑھیں گے وہ قصیدہ لامیہ ہے (عرب میں مردّف قافیے نہیں کہے جاتے۔ قصیدے میں ردیفت

اہل عجم کا اختراع ہے۔)

صورت میں تو اشعار قصیدہ مثل اشعار غزل کے ہوتے ہیں لیکن معاً قصیدہ کے اشعار میں کسی کی تعریف یا مذمت کی جاتی ہے۔ ابتداءً وعظ و نصیحت یا بہار کی تعریف یا ابر بہار کے فیضان کا حال یا زمانہ کی شکایت یا کوئی اور علمی مسئلہ بیان کرکے پھر ممدوح کی مدح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ باعتبار مضمون بھی یہ غزل سے بالکل جدا چیز ہے۔ اس میں داخلی (SUBJECTIVE) اور خارجی (OBJECTIVE) دونوں طرح کے مضمون نظم کئے جاتے ہیں۔

قصیدہ کے لئے (۱) شکوہ الفاظ (۲) جذالت نظم (۳) بلندئ خیالات (۴) نزاکت مضمون کا ہونا لازم و واجب ہے مگر ہر ایک بات انتہائے بلاغت پر ہونا چاہیئے اگر انتہائی فصاحت اور کمال بلاغت نہیں ہے تو حقیقت میں وہ قصیدہ ہی نہیں ہے۔

قصیدے کی ابتدا دو صورتوں سے کی جاتی ہے (۱) مدح سے پہلے کچھ اشعار بہاریہ عشقیہ (حسن و عشق اور ان کے لوازمات کے متعلق) یا شکایت زمانہ (شہر آشوب) یا کوئی علمی مسئلہ کہا جائے۔ اگر بہار یا عشقیہ مضامین سے ابتدا کی ہے تو اس کو تشبیب کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر دیگر قسم کے مضامین سے ابتدا کی ہے تو اس کو تمہید کہتے ہیں۔ جس جگہ تمہید یا تشبیب کو ختم کرکے اصل مقصد یعنی مدح کی طرف رجوع کرتے ہیں اس کو فارسی اور اردو میں گریز کہتے ہیں۔ عربی اصطلاح میں اس کو تخلیص یا تخلص کہتے ہیں اور یہی سب سے مشکل مقام قصیدے کا ہے۔ عمدہ گریز کو جو کم سے کم الفاظ میں کر دیا جائے

"حسن تخلص" کہتے ہیں (یعنی جس چیز کے بیان میں شاعر اپنے اصلی مقصد کے بیان سے پہلے پھنس گیا تھا وہاں سے خوب صورتی کے ساتھ خلاصی حاصل کر کے اپنے اصلی مطلب یعنی مدح ممدوح پر آن پہنچا) اس ارادہ پر ایک معقول اشارہ بھی ہوتا ہے۔

جس قصیدے میں گریز یا حسن تخلص نہ ہو اس کو مقتضب (دم بریدہ) کہتے ہیں مدحیہ قصیدوں میں اکثر و بیشتر دعائیہ اشعار سے مدح شروع کر دیتے ہیں اور اگر دعا کے ساتھ کچھ شرط لگا دیں تو اس کو شرطیہ ورنہ دعائیہ کہتے ہیں۔

اگر قصیدے میں ایک مطلع شروع میں یعنی تمہید یا تشبیب کی ابتدا میں ہو اور ایک شروع مدح میں ہو تو ذو مطلعین کہتے ہیں لیکن اگر قصیدے میں کئی مطلع ہوں تو اسے ذو المطالع کہتے ہیں اور قصیدے میں موقع سے کئی مطلع ہونا حسن قصیدہ شمار کیا جاتا ہے۔

(۲) دوسری قسم قصیدہ کی خطابیہ ہے۔ جس میں ابتدا ہی سے اصل مطلب یعنی مدح ممدوح کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے قصیدے کو مجرّدیہ بھی کہتے ہیں اور بعض اہل عروض نے اس کا نام مکابرہ رکھا ہے۔

عام طور سے قصیدے کے پانچ اہم اجزا ہیں۔

(۱) تمہید یا تشبیب (۲) گریز یا تخلص (۳) مدح (۱) غائب اور (۲) مدح حاضر (۴) حسن طلب (۵) دعا و خاتمہ۔

ان میں سے تین چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہی مقام قصیدے میں بہت نازک اور مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ اوّل تشبیب یا تمہید

دوسرے حسن تخلص جس سے یہ نہ معلوم ہو کہ مصنف قصہ کر رہا ہے کہ اب اس مضمون کو چھوڑ کر دوسری طرف جاتا ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی بے تکلفی ہو کہ دفعتاً بات میں بات پیدا کر کے وہ مدح پر آ گیا۔ تیسرے دُعا۔ لیکن بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ حسن الطلب یا اس مضمون کی جس کے لئے قصیدہ کہا جاتا ہے عمدگی کی بہت ضرورت ہے۔

تمام صاحبان فن اس بات پر متفق اللفظ ہیں کہ تمام اصناف شعر میں قصیدہ نہایت اہم چیز ہے۔ اس سے زیادہ مشکل اور دشوار گذار کوئی صنف شعر نہیں ہے۔

یہاں ہم کو فارسی قصیدہ گویوں کے نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ اردو شعرا نے ہمیشہ فارسی کے قصیدہ کی پیروی اور تقلید کی ہے اور آج تک کرنا لازم وواجب ہے ورنہ قصیدہ قصیدہ نہ رہے گا۔

اردو کے مشہور قصیدہ گو شعرا میں سب سے پہلے سوداؔ اور پھر ذوقؔ و مومنؔ ہیں دیگر مشاہیر میں امیرؔ، منیرؔ، شہیدیؔ، صفیؔ، محسنؔ، عزیزؔ اور مولانا نظمؔ طباطبائی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ قصیدے میں "غزل" کہنا بہت مشکل اور اہم کام ہے اس واسطے کہ غزل میں عشقیہ مضامین نہایت نرم و سلیس الفاظ میں نظم کئے جاتے ہیں اور قصیدے کے لئے "جزالت" نظم اور "شکوہ" الفاظ "بلندی" خیال ہونا ضروری ہے، اب اگر غزل بصورت غزل آئے تو قصیدہ کے اشعار سے کیوں کر ہم آہنگی کرے دوسرے یہ کہ خارجی مضامین قصیدہ میں

داخلی مضمون غزل کیوں کر لکھیں۔ یا یوں سمجھئے کہ مضمون آفرینی کے ساتھ جذبات نگاری کیوں دوش بدوش چلے انھیں سب باتوں اور مشکلوں کی وجہ سے قصیدے کی غزل بہت مشکل چیز ہو گئی ہے اردو میں سودا نے اس کو خوب نبھایا پھر محسن کاکوری نے، یہاں محسن جو قصیدہ لامیہ بطرح سودا پڑھ رہے ہیں اس میں بھی انھوں نے دو غزلیں نہایت کامیابی سے کہی ہیں (ایک تشبیب میں دوسری مدح میں)

۵۔ مثنوی:۔

لغت میں تثنیہ بمعنی دو، یعنی دو مصرعوں والی نظم اور یہ دونوں مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوں۔ شاعری کی اصطلاحات میں وہ نظم جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ آئے اور ہر شعر کا قافیہ اپنے پہلے اور بعد کے شعر سے الگ ہو۔ اس قسم کے تمام اشعار کے مجموعہ کو مثنوی کہتے ہیں۔ اس صنف شعر میں کوئی تاریخی واقعہ یا فرضی قصہ یا اخلاقی، تمدنی معاشرتی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ جیسے کہ اردو کی مشہور ترین مثنویاں (۱) سحر البیان (۲) گلزار نسیم (۳) زہر عشق۔

شعرائے اردو میں یہ صنف بہت مقبول ہے۔ اس کی بحروں اور قواعد نظم میں فارسی اصول عروض کی پابندی کی جاتی ہے۔

مشرقی ادیب کہتے ہیں کہ یورپ کے ایپک (EPIC) اور ڈراما (DRAMA) کا جواب ہم اپنی مثنوی سے دے سکتے ہیں، اس دعویٰ کے دلائل اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ اس کو مان ہی لیا جائے، ہاں یہ کہا جا سکتا

ہے کہ اردو کا بلینک ورس (BLANK VERSE) مثنوی ہے ایپک اور ڈراما کا جواب ایک حد تک مرثیہ ہو سکتا ہے۔ بے چاری مثنوی کی کیا بساط جو تمام وہ خصوصیتیں جو ایپک اور ڈراما میں ہوتی ہیں ان کو نبھا سکے۔ ہاں کچھ باتیں مثنوی میں علاوہ بلینک ورس کے مدمقابل ہونے کے ہیں۔ مثلاً رزمیہ۔ ایسی مثنویاں اردو میں تو بہت شاذ ہیں، ہاں فارسی میں شاہنامہ یا حملۂ حیدری ہیں جن میں جنگ کا نقشہ مثل آئینے کے صاف کھینچا گیا ہے، ایک چیز جو ان دونوں میں مشترک ہے ما فوق البشر ہے جس سے مثنوی میں ایپک کا انداز ملتا جلتا ہے۔ لیکن ڈراما اور مثنوی میں جو چیز مشترک ہے وہ صرف بلینک ورس ہے اس واسطے کہ اردو کے اصناف سخن میں اس قدر کم ضرورت قافیہ کی کسی اور نظم میں نہیں ہوتی جتنی کہ مثنوی میں۔ انگریزی کے بلینک ورس کو ہم سوائے مثنوی کی صورت کے اور کسی طرح ظاہر کر ہی نہیں سکتے۔ بلینک ورس کی طرح مثنوی میں سلاست بیان، صفائی بندش اور روانی اصولاً نہایت ہی لازمی چیزیں ہیں اور حقیقتہً یہ باتیں اس واسطے ضروری ہیں کہ قافیہ کے تسلسل کی پابندی ہٹانے کے بعد نظم میں جان رہے۔

جہاں تک ڈراما کے اصول کا تعلق ہے اس سے اور مثنوی سے بعد المشرقین ہے کیوں کہ مثنوی میں نہ تو کیرکٹر (CHARACTER) نویسی ہے نہ پلاٹ (PLOT) یعنی دار ابست قایم کیا جاتا ہے۔ عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں، مثنوی میں ان کا کہیں پتہ نہیں اور نہ

وہ دل چسپ مکالمے ہی ہوتے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں، واقعات کی رفتار نہایت آہستہ اور عمل مفقود رہتا ہے، لیکن ایک بات یہ ضروری ہے کہ مثنوی کا خاتمہ عموماً مہتم بالشان واقعات یا کسی نصیحت آمیز حکایت پر کیا جاتا ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ مثنوی قوم و ملک کی انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPAEDIA) ہوتی ہے اور پڑھنے والا جب اس کے مضمون کو ختم کرتا ہے تو اکثر وہ باتیں جو اس کے ذہن سے محو ہو چکی ہوں پھر ابھر آتی ہیں اور وہ ان اخلاق سے جو مجملاً بیان کر دئے گئے ہیں کچھ نہ کچھ بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

مثنوی کی بحریں:-

اردو میں مثنوی کے لئے سات بحریں مقرر ہیں انھیں میں مثنوی کہی جاتی ہو اور ان کے علاوہ کسی بحر میں کہنا جائز نہیں یعنی قانون عروض میں جرم ہے گو کہ (انڈین پینل کوڈ) (INDIAN PENAL CODE) مجموعہ تعزیرات ہند میں اس کے متعلق کوئی دفعہ مندرج نہیں ہے۔ ان سات بحروں کی پابندی اس واسطے مقرر کی گئی ہے کہ یہ بحریں ایسی ہیں جن میں تمام الفاظ بغیر توڑے مروڑے صاف صاف اپنے اصلی رنگ روپ میں نظم ہو سکتے ہیں اور اسی لئے صفائی بندش، سلاست بیان اور روانی نظم کو اہمیت دی گئی ہے یہ بحریں اس واسطے مخصوص کی گئی ہیں کہ تمام الفاظ سیدھے سیدھے اپنی اصلی صورت میں نظم ہو سکیں اور اگر شاعر بوجہ کم مشقی کے مثنوی میں الفاظ کو سیدھا نظم نہیں کر سکتا تو اچھا تو یہی ہو کہ

وہ اس طرزِ نظم سے دست بردار ہو جائے اس میں ٹھونس ٹھانس، توڑ مروڑ نہ کرے اور یہ عذر نہ پیش کرے کہ اس بحر میں یہ الفاظ نہیں سما سکتے تھے، کیا کرے۔ مثنوی سے جو سات بحریں مخصوص ہیں ان کا ذکر کر دینا تلامذۂ نظم کے واسطے ضروری سمجھ کر یہاں درج کی جاتی ہیں اور حتی المقدور ان ہی مثنویاں سے ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو اس مشاعرے میں پڑھی گئی ہیں۔

(۱) پہلا وزن متقارب مثمن مقصور یا محذوف

فعولن فعولن فعولن فعل یا فعولن فعولن فعولن فعول

(اس بحر میں جنگ کا ذکر یا محافل بادشاہانہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے شاہنامہ فردوسی اور مثنوی سحر البیان حسن)

مثنوی سحر البیان جو عشقیہ مثنوی ہے مگر ذکر سلاطین و محافل شاہانہ کا بیان ہے۔

مثال :۔

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے کو پہلے قلم (سحر البیان)

(۲) دوسرا وزن :۔ ہزج مسدس محذوف یا مقصور

(۱) مفاعیلن مفاعیلن فعولن

(۲) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

(اس بحر میں عموماً عشقیہ مثنویاں ہوتی ہیں جیسے مثنوی اعجاز عشق)

خداوندا تراعبد اقل ہوں اسیرِ حلقۂ طولِ امل ہوں

(۳) تیسرا وزن :۔ ہزج مسدس رکن اول اخرب مقبوض یا اخرم اشتر رکن آخر محذوف یا مقصور، اس طرح اس وزن کی چار صورتیں ہوگئیں۔

پہلی صورت :۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف

مفعول مفاعلن فعولن مفعول مفاعلن فعولن

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

(گلزار نسیم)

دوسری صورت : ہزج مسدس مقبوض محذوف مقصود

مفعول مفاعلن مفاعیل مفعول مفاعلن مفاعیل

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر نیرنگ بہار، باغ کشمیر

(گلزار نسیم)

تیسری صورت :۔ ہزج مسدس اخرم۔ اشتر محذوف

مفعولن فاعلن مفعول مفعولن فاعلن مفعول

مانگا کاغذ، دوات خامہ لکھا گل چیں کے نام نامہ

(گلزار نسیم)

چوتھی صورت :۔ ہزج مسدس اخرم۔ اشتر۔ مقصور

مفعولن فاعلن مفاعیل مفعولن فاعلن مفاعیل

حمالہ نام دیونی ایک چھوٹی بہن اسکی تھی بڑی نیک

(گلزار نسیم)

(۴) چوتھا وزن :۔ خفیف مسدس مخبون یا محذوف

فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فاعلاتن مفاعلن فعلان

(اس بحر میں معاملات عشق و محبت بیان کرتے ہیں۔ اکثر نصائح اور

پند و حکمت کے لئے بھی مفید ہے۔

فاعلاتن مفاعلن فعلن فاعلاتن مفاعلن فعلن

زہر عشق :۔ جس محلہ میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتا تھا ایک سوداگر (شوق)

(۵) پانچواں وزن :۔ بحر رمل مسدس مقصور[۱] یا محذوف

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

(اس بحر میں حکایات علما اور حقایق حکمت و پند و نصائح بیان کرتے ہیں)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

میں جو چندے دہر میں مہماں رہا گرچہ دانا تھا ولے ناداں رہا

(از مثنوی ایجاد رنگیں)

(۶) چھٹا وزن :۔ رمل مسدس مخبون مقصور[۱] یا محذوف[۲]

فاعلاتن فعلاتن فعلن یا فاعلاتن فعلاتن فعلان

(اس بحر میں حکماء اور اولیاء اللہ کے تذکرے عام طور سے نظم کرتے ہیں)

نوٹ :۔ اس بحر میں اس زحاف کے موجد امیر خسرو دہلوی ہیں۔

فاعلاتن فعلاتن فعلن فاعلاتن فعلاتن فعلن

ساقیا زہر پلا دے مجھ کو شربت مرگ چکھا دے مجھکو

مثنوی قول حسین (از مومن خاں مومن)

(۷) ساتواں وزن :۔ سریع مسدس مطوی[۱] محذوف یا مقصور[۲]

مفتعلن مفتعلن فاعلن یا مفتعلن مفتعلن فاعلان

(امیر خسروؒ دہلوی کی مثنوی قرآن السعدین اسی بحر میں ہے)

اردو میں اس بحر میں بہت کم مثنویاں ہیں۔

مفتعلن مفتعلن فاعلن مفتعلن مفتعلن فاعلن

صدر کی بازار میں ہے اک دبنگ عار اطبا و طبابت کا ننگ

مثنوی سودا (ہجو حکیم غوث)

جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اور بحروں میں بھی مثنویاں لکھی جا سکتی ہیں لیکن وہ سب غیر دلچسپ رہتی ہیں اور ان کے اوزان سماعت کو متلذذ نہیں کرتے اسی وجہ سے غیر دل پسند اور غیر موثر ہوا کرتی ہیں۔ اسی واسطے علم الصوت (PHONETICS) کے ماہر عروضیوں نے یہ سات وزن منتخب کر لئے ہیں۔

۶۔ رباعی:۔

رباعی کو فارسی میں ترانہ، دوبیتی، حفتی اور چار مصراعی بھی کہتے ہیں۔ یہ صنفِ کلام مخصوص فارسی سے ہے کیونکہ اس کا ایجاد خاص سرزمین ایران پر ایک ایرانی شاعر کے ذریعہ سے ہوا۔ یہ صنف عربی میں نہ تھی اگر اب ہو بھی تو تتبع عجم میں سمجھنا چاہیئے۔

اس میں شرط یہ ہے کہ چار مصراع متفق الوزن اور متفق القوافی ہوں مصرع سوم میں اگر قافیہ نہ ہو تو مضائقہ نہیں اگر ہو تو بہت اچھا ہے۔

رباعی فارسی زبان کے مشہور شاعر رودکی کی ایجاد ہے۔ بقول دولت شاہ سمرقندی اس کے ایجاد ہونے کا واقعہ محمد بن عیسٰی نے اپنے رسالۂ عروض میں یوں لکھا ہے:۔

سنہ۳۰۰ ہجری میں ایک دن استاد رودکی (بقول دولت شاہ سمرقندی اور بقول المعجم شمس الدین) غزنی میں چلا جاتا تھا۔ وہ عید الفطر کا دن تھا کہ راہ میں دیکھا کہ ایک جگہ امیر یعقوب بن لیث صفا کا گیارہ برس کا لڑکا جو بہت حسین تھا عید کی خوشی میں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ جوز بازی کھیل رہا تھا (جوز بمعنی اخروٹ۔ جوز بازی ایک کھیل ہے جس میں سات اخروٹ ایکدم سے لڑھکاتے ہیں اور ہار جیت یہ ہے کہ ساتوں اخروٹ پہلے ہی بار لڑھکاتے ہی ایک گڑھے میں جو پہلے ہی سے بنا لیتے ہیں گر جائیں)

لڑکے کے لڑھکانے میں چھ اخروٹ تو صاف صاف گڑھے میں گر پڑے ایک باقی رہ گیا وہ بھی ہلکے ہلکے لڑھکتا ہوا ذرا دیر بعد اس گڑھے میں جا پڑا اس کو دیکھ کر امیر کا لڑکا بہت خوش ہوا اور خوشی میں تالیاں بجا بجا کر کہنے لگا۔ (غلطاں غلطاں میرود تا لب گور) یعنی لڑھکتے لڑھکتے آپ ہی آپ گڑھے میں پہونچ گیا۔

رودکی نے جو یہ بے تحاشا خوشی میں مصرع لڑکے کے منھ سے سُنا پھڑک گیا۔ اس کو بہت پسند کیا۔ اسی کو سُن کر رودکی نے چوبیس وزن ایجاد کئے (رودکی کے بعد عروضیوں نے دس ہزار سے زیادہ وزن اسی ایک بحر ہزج مثمن سے نکالے ہیں)

المعجم فی المعائر اشعار العجم میں شمس الدین محمد بن قیس جو ساتویں ہجری کے ربع اول کا مصنف ہے کہتا ہے۔

"متقدمین شعرائے عجم میں ایک شاعر نے (شاید وہ ایک شاعر رودکی ہو

اخرم اور اخرب کے اجتماع سے نیا وزن نکلا جس کو وزن رباعی کہا جاتا ہے۔

یہ ایسا مقبول وزن ہے کہ طبایع سلیم اکثر اس کے شائق ہیں۔"

علامہ پروفیسر حافظ محمود صاحب شیرانی نے جو تحقیق فرمائی وہ یہ ہے:-

"...... نظم کی وہ صنف خاص جس کو ہم رباعی کہتے ہیں کوئی شخصی ایجاد نہیں، بلکہ "چہار بیتی" کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایام ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو "چہار بیتی" کہا جاتا ہے رائج تھی۔ اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہزج کے مربعات میں اس کا شمار کرتے تھے، تعداد میں وہ چار اشعار ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لازمی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور مصرع سوم خصی رکھا گیا۔...... جب اخرب یا اخرم میں ایسے چار شعر جمع ہو گئے اور آخر میں قافیہ پایا گیا، قدما نے چہار بیتی نام رکھ لیا لیکن متاخرین نے ان چار اشعار کو چار مصرعے شمار کیا اس لئے چہار بیتی کا نام دو بیتی رکھا گیا۔

(تنقید شعر العجم صفحہ ۷ تا ۹)

چنانچہ محقق طوسیؒ معیار الاشعار میں بھی یہی تحریر فرماتے ہیں۔

"رباعی بحر ہزج مثمن سے مخصوص ہے اور نو زحافات واقع ہونے سے چوبیس وزن پیدا ہو گئے ہیں ان میں بارہ وزن (اخرب الصدور والابتدا ہیں)

اور بارہ وزن اخرم الصدر و الابتدا میں)

یہ بالکل مانی ہوئی بات ہے کہ صرف چار مصرعوں کے متفق الوزن یا متفق القوافی ہونے سے کوئی نظم رباعی نہیں ہو سکتی جب تک وہ مخصوص اوزان رباعی پر نہ ہو بصورت دیگر اس کو قطعہ کہیں گے لیکن اگر بحر ہزج مثمن کے ان مخصوص چوبیس اوزان میں سے کسی وزن پر چار مصرعے متفق القوافی اور متفق الوزن ہوں تو بیشک رباعی ہے۔

اردو میں سب شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں، مگر یہ خاص صنف مرثیہ گویوں کے واسطے مخصوص ہے، چنانچہ اس مشاعرہ میں انیسؔ، دبیرؔ و رشیدؔ رباعیاں پڑھیں گے یوں تو اکبرؔ و حالیؔ وغیرہ نے بھی رباعیاں کہی ہیں مگر رشید نے "پیری" (بڑھاپا) کے حال میں جو رباعیاں کہی ہیں وہ ان کا ایک خاص کارنامہ ہیں۔

۷۔ قطعہ:۔

لغت میں کسی چیز کے ٹکڑے کو قطعہ کہتے ہیں لیکن شاعروں کی اصطلاح میں ان اشعار کا نام ہے جو غزل یا قصیدہ کے شعروں کو ایک ساتھ ملا کر مطلب نکل سکے۔ اس تمثیل میں اکبر الہ آبادی قطعہ پڑھ رہے ہیں۔ قطعہ کے اشعار دو سے کم نہیں ہوتے اور زیادہ کی حد مقرر نہیں ہے بعض عروضیوں نے (۱۷) تک لکھا ہے، قطعہ کے لئے با مطلب ہونا بھی لازم نہیں ہے۔

۸۔ سلام

یہ صنف نظم محض مرثیہ گویوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جب سے مرثیہ

مسدس کی صورت میں رائج ہوا، مرثیہ گویوں کو غزل یا قصیدہ کے طرز پر اشعار کہنے کا کم موقعہ ملنے لگا، دوسری وجہ یہ کہ غزل کے طرز کے اشعار میں اگر تغزل ہو تو مرثیہ (جس کے معنی بکا کے ہیں) سے کیا ربط رکھیں اس لئے مرثیہ گویوں نے اپنی غزل کی مشق باقی رکھنے اور اپنی مشاقی غزل میں دکھانے کی غرض سے مدح و مصائب آل اطہار کو بطور قصیدہ نظم کرنا شروع کیا اس میں انھوں نے سنگلاخ زمینیں (طبع زاد طور پر) نکالیں۔ مشکل قافیوں میں اور پیچیدہ پیچیدہ ردیفوں کے ساتھ غزل کے طرز پر اشعار کہے چوں کہ ان میں تغزل (مثلی اشعار کے) نہ تھا بلکہ مدح و مصائب و فضائل اہلبیت تھی اس واسطے اس کا نام غزل یا قصیدہ کے بجائے سلام رکھا اور بالعموم تعداد اشعار تقریباً غزل کے برابر اور قصیدے سے کم ہی رکھی۔

"سلام" اس واسطے کہا کہ جس طرح کسی بزرگ سے گفتگو کرتے وقت سب سے پہلے سلام کرتے ہیں اسی طرح مرثیہ پڑھنے سے پہلے سلام پڑھا جاتا ہے۔ سلام سے پہلے رباعیاں پڑھتے ہیں۔

۹۔ مرثیہ :۔

مرثیہ کے معنی ہیں نظم رنج و بکا، اس صنف نظم میں کسی مرنے والے کی موت پر اظہار رنج و غم کرتے ہیں اور اس کے اوصاف حمیدہ کو یاد کرکے روتے ہیں، اسی میں اس کے مرنے کا حال اور طریقے بھی نظم کرتے ہیں۔ شعرائے عرب نے مرثیے بہت کہے ہیں۔ دیوان حماسہ میں ایک

پورا باب کا باب اس صنف نظم میں مندرج ہے۔ اور باب المراثی ایک خاص حصہ اس کے دیوان کا ہے اہل اسلام ہمیشہ سے اس کے بہت شایق رہے ہیں۔

یہ قصیدہ کے بالکل برعکس ہے، یعنی قصیدہ زندہ شخص کی تعریف ہے مرثیہ مردے کے اوصاف پسندیدہ کا تذکرہ اور اس کی موت پر اظہار رنج ہے۔ اردو شعرا کی اصطلاح میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر جس نظم میں کیا جائے اس کو مرثیہ کہتے ہیں، میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد سے اس نظم کے واسطے مسدس کی صورت ہونا گویا ایک ضروری شرط قرار پایا گیا ہے۔

اردو میں ابتداءً اس صنف نظم میں صرف (بین) کے اشعار ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کے مرثیے بالعموم بہت مختصر ہوتے تھے اور سودا سے پہلے یہ صنف نظم بصورت قصیدہ یا مثنوی یا مربع ہوا کرتی تھی (سودا نے مربع بھی کہے ہیں اور آخر میں مسدس ہی کی صورت میں کہے)، اور "سوز" کی صورت میں (بہ لحن غمگین) پڑھے جاتے تھے، امتداد زمانہ نے مرثیہ کا دائرہ وسیع کیا، رفتہ رفتہ طرز خواندگی میں بھی تغیر ہوا اور بجائے سوز کے مرثیہ تحت اللفظ پڑھا جانے لگا اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے۔ مثلاً چہرہ، گریز، مدح و مناقب، یا دشمنوں کے معائب، رجز، مناظر جنگ، مناظر قدرت، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، دو حریفوں کی معرکہ آرائی، سامان حرب و ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے

مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا، آخر کار وہ اردو نظم کی ایک مستقل صورت و صنف ہو گیا۔

عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو صنف نظم پر عمل درآمد ہوا وہ رجز کے اشعار ہوں گے یعنی جب دو مبارز طلب بہادر اپنے شرافت نسب اور جرأت و ہمت کے کارناموں کو بیان کر کے ایک دوسرے کو مرعوب کرنا چاہتے تھے تو فخریہ اشعار کہتے تھے پھر جب شاعر کو جلب منفعت اور ذاتی مفاد کی طمع نے گھیرا ہو گا تو وہ خودداری کی بلندیوں سے اتر کر بادشاہوں کے درباروں کی طرف قصیدہ کہہ کہہ کر چلا ہو گا۔ حمد و نعت و منقبت کو ترک کر کے سلاطین و امرا کی مدح میں ساری قوت نظم صرف کرنے لگا۔ جتنی ان قصیدوں سے دولت ملتی گئی اور اس تملق کی قدر ہوتی گئی اسی قدر عرب میں مرثیہ پر زوال آتا گیا۔

گو فارسی شاعری میں عربوں کے تسلط کے زمانہ ہی سے قصیدہ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی قدیم شعرائے فارس کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش موجود ہے مثلاً شاہنامے میں سہراب کی ماں (تہمینہ) اپنے پیارے اکلوتے بچے کی اچانک ہلاکت پر روئی ہے، یہ اور ایسے بہت سے اشعار لغوی معنوں میں مرثیہ ہیں (فارسی شعرا کی اصطلاح میں بھی مرثیہ کے واسطے مسدس یا مخمس ہونا لازمی نہیں)، خسرو اور سعدی نے اپنے مربیوں کے مرثیے کہے مگر مقبول نہ ہوئے۔ سب سے پہلا مُلّا محتشم کاشی (علیہ الرحمہ) نے اس صنف خاص میں ایک خاص جوش و خروش پیدا کیا۔ جس سے نظم و ادب ایران میں ایک

ہل چل مچ گئی اور تغیر عظیم رونما ہوا۔ اب ایرانی شعرا صنف مرثیہ کو بہت پسند کرنے لگے اور متعدد مرثیہ کہے گئے۔

اُردو میں مرثیہ :۔

اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ ان ہی ابتدائی کاوشوں میں صنف مرثیہ بھی داخل ہے، شاہان گول کنڈہ اور بیجاپور شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدردان تھے۔ خود بھی بڑے مذہبی آدمی تھے اور شاعر خوش گو ہونے کی وجہ سے مرثیہ کو پسند بھی کرتے تھے اور خود کہتے بھی تھے۔ گو کہ اس زمانہ میں مرثیہ دیگر اصناف کلام کی طرح بالکل ابتدائی حالت میں تھا (بقول صاحب "گل رعنا" ولی نے ایک مرثیہ بصورت مثنوی نظم کیا تھا) رفتار زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ دکن سے شاعری دہلی تک پہونچی۔ یہاں لوگ مرثیہ کے پسند کرنے والے ضرور تھے مگر کہنے والے اس کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر کہتے تھے۔ چونکہ یہ صنف نظم محض مذہبی حیثیت رکھتی تھی اور سوائے رُونے رُلانے کے اور کسی غرض کے لئے نہیں کہی جاتی تھی اس لئے اس کو نقادانہ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا جن سے غزل یا قصیدے جانچے جاتے تھے اسی لئے اگر اچانک کوئی سقم بھی ہو تو عیوب شاعری پر اعتراض اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی۔ جب ہی سے یہ مثل مشہور ہے۔ " بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خوان "

نکات الشعراء میں میر تقی میر نے اور اپنے تذکرہ میں میر حسن نے ایسے شعراء کا حال لکھا ہے جو محض اعتقادات کی بناء پر طرز ثواب دکار عقبیٰ

د کر کہتے تھے جیسے میر امانی، میر عاصمی، آل علی، درخشاں، سکندر، جعفر
) وغیرہ۔

میر تقی میر، سودا، میر ضاحک، حسن سب نے مرثیے کہے مگر وہ کچھ شمار میں
یں آئے، ہاں ایک بات یہ ہوئی کہ سودا کے زمانے تک مرثیے مربع
چار مصرعے) کی صورت میں ہوا کرتے تھے، سودا نے بصورت مربع بھی کہا اور
ں کو مسدس (چھ مصرعوں کا بند) بنا کر بھی کہا اور یہ آخر الذکر صورت
ی مقبول ہوئی کہ سودا کے بعد جتنے مرثیہ گو شاعر گزرے سب اسی صورت
ں مرثیہ کہتے رہے، سودا کے بعد میر ضمیر نے جو اضافہ کیا وہ صورت کی تبدیلی
تھی بلکہ مضمون میں اضافہ تھا یعنی جدید تشبیہیں اور نادر استعارے۔

اب مرثیہ کے واسطے لازمی طور پر مسدس کی صورت ہونا ضروری قرار پایا۔
تیس پچاس بندوں سے تجاوز کر کے اس کے ڈیڑھ دو سو بند تک ہونے
۔ اس طرح کہ پہلے تمہید، پھر سراپا، پھر میدان جنگ کا نقشہ،
رخصت، تلوار، گھوڑے کی تعریف، جنگ، پھر خاتمہ یعنی شہادت وغیرہ۔
س جدید طرز کی بڑی قدر ہوئی اور اس سے مرثیہ گویوں کے عالم میں ایک
انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے کا مرثیہ محض رونے رلانے کے واسطے کہا
اتا تھا، اب اس میں کمال شاعری اور ادبی معیار دکھایا جانے لگا گویا اردو
ب میں اس کا وہی مرتبہ ہو گیا جو انگریزی ادب میں ڈراما کا تھا۔ اسی واسطے
س کی جانچ پڑتال بھی اسی طرح کی جانے لگی جس طرح دیگر اصناف شعر کی
وتی تھی۔ ان جدید مطالب کے اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی

روح پھونک گئی، اب وہ شاعری کا ایک موافق صنف قرار پایا۔ جس سے اہل اسلام کے اکثر فرقے اور بڑی تعداد اہل ہنود تک کی دل چسپی لینے لگی اور بہت ذوق وشوق سے سننے لگے۔

میر خلیق کے خاندان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور مرثیہ کو خالی تشبیہوں اور لفظی تناسب کے مقابلہ میں زیادہ ملحوظ رکھا، یہی چیز انیس اور دبیر کے ہاں، بہ الامتیاز ہے۔ میر خلیق یعنی میر انیس کے والد کا خاندان زبان اردو کے صحت اور محاورے کی صفائی کے لئے مشہور ہے چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ "اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو"۔

(تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۱۵)

فلک مرثیہ گوئی کے درخشاں ستارے میر انیس اور مرزا دبیر اس مشاعرے میں سب کے آخر میں پڑھیں گے۔ جن کا کلام نہایت مؤثر ہے اور قدرتی شاعری کا پرتو ہے۔ مرثیہ کی چند خصوصیتیں علاوہ شستگی ہونے کے یہ بھی ہیں کہ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھری ہے، ناسخ کے دور میں اردو شاعری جس رنگ میں پڑ گئی تھی اس سے ان کا کلام مطلقاً صاف ہے۔ قصائد کی بے کار لفاظی جس میں دور از قیاس مبالغے ہوں اس میں مطلق نہیں، سب سے عمدہ چیز وہ ہے جو اردو شاعری میں کسی صنف کلام میں بھی نہیں یعنی مناظر قدرت کے سچے فوٹوگرافات دل پذیر الفاظ میں کھینچے ہیں۔ "مقتضائے حال" تو میر انیس کی خصوصیت خاص ہے۔

ضمیمہ اوّل

دراصل مرثیہ نگاری اردو شاعری کا وہ نیا دور ہے جس نے اس زمانے کی بداخلاقیوں میں پھنسی ہوئی شاعری کو جو مبالغے، لفاظی اور تصنع میں فنا ہو رہی تھی نہ صرف بچا ہی لیا بلکہ اس کو ایسا اُبھارا کہ یہ فارسی اور عربی علم ادب و نظم کا پہلو سے پہلو دبا کر بیٹھنے لگی۔

ضمیمہ دوم

اردو شاعری کے ہر دور کے خصوصیات

نمبر (۱) حضرت ولی کا دور :۔

اس دور میں سوائے ولی کے شاید ہی کسی شاعر نے زبان اور ادب کی کوئی خدمت کی ہو۔ اگر ولی نہ ہوتے تو یہ دور انحطاط تھا۔

ولی نے بھاشا کے الفاظ کے علاوہ بھاشا کے جذبات کو اردو عاشقانہ شاعری میں ڈھالا ولی کے بعد آنے والوں نے حقیقت میں ولی کی ناقص تقلید کی یعنی ہندی الفاظ تو استعمال کئے لیکن ہندی کی سب سے اچھی چیز یعنی جذبات نگاری کو چھوڑ بیٹھے۔ اور اس کے بجائے فارسی کے طرز ادا کو اختیار کرنے لگے، نیز زبان کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی۔ غیر مانوس کو ترک کرنا اپنے بعد آنے والوں کے واسطے چھوڑ گئے۔

اس دور میں "ایہام" کوئی ہندی دوہوں سے سیکھی گئی۔ سیدھی سادی بات کہنے کے علاوہ الفاظ ذو معنی کہنے کی فکر میں لگے رہے اور کلام کا لطف واثر کھو جانے دیا۔ بس ولی اپنی ذات سے ان چیزوں سے بچا۔ ولی نے تکلف و ایہام کو چھوڑا بھی اور کلام میں لطف و سادگی سے مزہ بھی بھر دیا۔

نمبر (۲) سودا، درد، حسن اور میر تقی میر کا دور :۔

زبان کی خوبی کی طرف متوجہ ہو کر اس کی اصلاح کی چنانچہ فارسی ترکیبیں

جو اب تک فارسی کلام تک محدود تھیں ان لوگوں نے ان کو گھلا ملا کر اردو کا جز بنا لیا۔ اور بالکل اپنا لیا، اسی کے ساتھ ہی ساتھ ہندی کے ثقیل الفاظ جو اب تک شاہراہ ادب میں سنگ راہ تھے ان کو ہموار کر کے راستہ صاف کر دیا۔ ان کے کلام میں تناسب اور خیال میں سادگی کے ساتھ صفائی پیدا ہوئی۔ اس دور کے آخر والوں نے سنگلاخ زمینوں اور پیچیدہ استعاروں سے گریز کیا، تاکہ خیالات الفاظ کے ساتھ ہی دلوں میں اتر جائیں "تاثیر اور درد اس دور کے شعرا کا مخصوص حصہ ہے۔" غزل کے عروج کے ساتھ ساتھ مثنوی اور قصیدے میں بھی اس دور کے کاملین نے عروج کمال تک پرواز کیا۔

ہو مثبی اس دور سے پہلے مسدس کی صورت میں نہ تھا۔ اسی دور میں اسس مقبول صورت میں آیا، میر تقی میر نے ایک نئی صنف یعنی "واسوخت" کا اضافہ اردو شاعری میں کیا اور سودا نے ہجو کہی۔

نمبر (۳) جرأت، انشاء و مصحفی کا دور:۔

زبان کی اصلاح، ثقیل الفاظ کا اخراج، زبان میں صفائی اور روانی مگر بعض الفاظ قدیم (مثلاً نت، ٹک، واچھڑے، جھمکڑا، زور یعنی بہت) اب بھی رائج ہیں مگر بہت سے نرم و فصیح الفاظ ہندی مستعمل ہونے لگے۔ پیشروؤں کے خیالات کو ادل بدل کر نظم کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں نکالی (انشا مستثنیٰ ہیں) ظرافت و تمسخر کی بھرمار، متانت و سنجیدگی کی جگہ تمسخر نے لے لی۔ مقامی اور ملکی خصوصیات کا ذکر ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے مختلف جشنوں، میلوں اور تہواروں کا حال بطور استعارہ

د تلمیح ذکر ہوا ہے۔

نمبر (۴) ناسخ، آتش، نسیم کا دور لکھنؤ میں اور ذوق، غالب، مومن کا دہلی میں:۔

اس دَور کے خصوصیات یہ ہیں، دو ذہنیتیں کارفرما ہیں، جن کی راہیں بالکل جدا جدا ہیں اس دور میں ملک کے طول و عرض میں سلطنت کا نقشہ بدل رہا ہے، دہلی اُجڑ رہی ہے اور لکھنؤ بظاہر آباد ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے اس دور کے شعراء کے کلام میں رجائیت اور قنوطیت دوش بدوش نظر آرہی ہے دہلی کے شعراء کے کلام میں گونہ یاس، اضمحلال و قنوطیت ہے، لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں اس کے برخلاف احساس شگفتگی نظر آتا ہے۔

ہر دو مرکزوں کے شعرا کو یک جا طور پر دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب مومن آتش خیالات و معنویت کی طرف زیادہ مائل ہیں، ذوق، ناسخ اور نسیم کا رجحان زیادہ تر زبان کی صفائی اور عروض کی طرف ہے۔

زبان کی صفائی، تشبیہات و استعارات کی رنگینی ہر دور سے بڑھی چڑھی اسی دور میں ہے، رعایت لفظی اور خارجی پہلو پر زور دینا کم و بیش سب ہی کے یہاں معلوم ہوتا ہے اور باستثنائے ذوق شاعری کا زیادہ تر زور غزل ہی میں رہا، نسیم نے مثنوی گلزار نسیم اسی دور میں کہی۔

فارسی الفاظ و ترکیب بہت تیزی سے اس دَور میں جگہ پانے لگی اور فن پر زیادہ توجہ ہوئی۔

اس دَور کے ختم اور پانچویں دَور کے ابتدا کا زمانہ تھا کہ اردو میں سب سے اہم چیز اپنے کمال کو پہونچ گئی۔ یعنی مرثیہ انیس و دبیر کا معرکۃ الآرا عہد

مرثیہ گوئی اسی دور سے شروع ہوا اور مرثیہ شاعری کی معراج الکمال کا نقطہ مان لیا گیا۔

نمبر (۵) امیر، داغ، جلال، تعشق کا دور:۔

اس دور میں:۔

(۱) شاعری میں رنگینی، معاملہ بندی، نزاکت و لطافت زیادہ ہو گئی۔

(۲) اس سے پہلے زمانہ کے تصنع، دور از کار تشبیہات، پیچیدہ استعارے کم ہونے لگے۔ سادگی نے پھر زور کیا۔ لطافت و سلاست زبان پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔

(۳) زبان کے محاورات، قواعد و صحت و کلام کا زیادہ خیال کیا گیا، صحت لغت کا لحاظ ہونے لگا، لغت کی کتابیں اور عروض کے رسالے لکھنا اساتذۂ فن نے شروع کیا اور اس طرح شعراء نے نثر میں بھی نظم کے دوش بدوش کچھ اضافہ کیا۔

(۴) یہی زمانہ مرثیہ کے فروغ کا بھی ہوا، تمام مشاق اساتذۂ غزل بھی مرثیہ کہنا اپنی استادی اور مشاقی کا طرۂ امتیاز سمجھنے لگے جس کی وجہ سے شاعری نے حسن و عشق کی کوچہ گردی سے قدم آگے بڑھا کر دوسری مفید تر راہ میں بھی گامزنی شروع کی، اب رزم و بزم کی داستانیں نظم کرنا (بہ فیض مرثیہ گوئی) جاری ہو گیا۔ منظر نگاری بھی تھوڑی بہت نظم کے دائرے میں آنے لگی، شعراء کو کردار نگاری سے بھی واقفیت ہونا شروع ہوئی اور مختلف و متعدد موضوعات اردو شاعری کے ہاتھ لگے۔

(۵) مرکز لکھنؤ اور مرکز دہلی اب بھی ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے تھے۔

نمبر (۶) موجودہ دور جلال کے بعد سے اسوقت تک کے شعرا کا دور:۔

اس دور میں:۔

(۱) مغربی اثر پڑا، سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ سے اردو شاعری متاثر ہونے لگی۔

(۲) اصلیت اور واقعہ نگاری روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور تصنع اتنا ہی کم ہونے لگا سچائی اور حقیقت جذبات اور واردات قلبی بھی ظاہر کی جانے لگی۔

(۳) موضوعات شاعری کا دائرہ وسیع ہوا مسلسل نظمیں مختلف اور متنوع عنوانات پر ظاہر ہونے لگیں، اکثر انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا گیا اور کبھی کبھی ان کا طرز نقل کے طور پر اختیار کیا گیا۔

(۴) غزل میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ترنم الفاظ، داخلی پہلو کا آجانا، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیات سے ہو۔

(۵) تصوف اصولی اور رسمی پیرایہ سے بڑھ کر رنگین شاعرانہ شکل میں آگیا۔

(۶) نفسیات کا گہرا مطالعہ ہونے لگا "انسان" اور "زندگی" کے متعلق پر لطف خیالات کا اظہار شروع ہوا۔

(۷) جو الفاظ اور مرکبات کثرت استعمال سے فرسودہ ہو گئے تھے ان سے گریز کرنا حتی الامکان ضروری سمجھا گیا۔

(۸) بڑا غضب یہ ہوا کہ کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کی تاثیر جو قدما کا مایۂ امتیاز تھا یک قلم جاتی رہی، سہل ممتنع کی مثالوں کو آنکھیں دیکھنے اور کان سننے کو ترس گئے، فارسی اور عربی کی نئی نئی ترکیبوں میں بعض شعرا کی لغزشیں صاف صاف نظر آنے لگیں مگر صرف ان کو جنھیں بصیرت تھی۔

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس
نہ کہ ہر کاو ورقے خواند معانی دانست

ضمیمہ سوم

ہر شاعر کی انفرادی خدمت اور خصوصیات

۱۔ حضرت ولی :۔ ہر صنف شاعری میں کلام موجود ہے، رعایت لفظی کا چسکا ہے لیکن کلام میں آمد ہے۔ شاہ جہاں آباد کے محاورات کو دکن کے محاورات پر ترجیح دی ہے، ہندی شاعری کے جذبات کو فارسی کے الفاظ میں ظاہر کیا، سچا رنگ غزل کا موجود ہے۔

۲۔ حضرت سودا :۔ ہندوستان کی چیزوں کو اپنے کلام میں نظم کرتے ہیں، ہندی کے ملائم اور شیریں الفاظ کو ترک نہیں کیا، غزل میں شیرینی و سادگی، قصیدہ میں مشکل زمینیں، متانت مضامین، زور الفاظ، علو خیال، جدید استعارے، طبیعت میں جدت پسندی، مرثیہ کو مربع سے مسدس میں تبدیل کیا۔

۳۔ حضرت درد :۔ سنجیدہ اور متین خیالات، پکا مذاق تصوف، بلندی خیال و جذبات، عشقِ حقیقی کا جلوہ ایسا پُرکار کہ مجازی عشق اس کی روشنی میں مدھم پڑ گیا، غزل میں پانچ سات شعر مگر سب منتخب و نشتر۔

۴۔ حضرت حسن :۔ درد کے شاگرد، درد، سودا اور میر کے مقلد تصوف کو غزل میں رواج دیا، تناسب لفظی کا چسکا، مثنوی کے شہنشاہ تفصیل میں ان کا جواب نہیں، ان کی مثنوی اپنے زمانہ کی معاشرتی زندگی کا

آئینہ، زبان پر پورا پورا قابو۔

۵۔ حضرت میرؔ :۔ ہر صنف شاعری میں کلام، غزل کے بادشاہ "سہل ممتنع" انھیں کا حصہ ہے، غزل میں سوز و گداز و خستگی، نشتریت رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی جس کا نتیجہ تاثیر، "آپ بیتی" میں "جگ بیتی" کا لطف پیدا کر دیتے ہیں، قصیدے میں سودا سے نیچے رہے مگر غزل میں سب سے اونچے۔ اتنے بلند کہ اب تک کوئی وہاں نہیں پہنچ سکا، ان کے "بہتر نشتر" سیکڑوں سے زیادہ ہیں، مثنوی میں بھی بہت کامیاب رہے "واسوخت" کے موجد ہوئے۔

۶۔ حضرت جرأت :۔ سوائے قصیدے کے سب کچھ کہا، زبان میں صفائی سادگی، محاورات کی بندش میں خوش مزاجی کا اثر نمایاں ہے کلام میں عمق اور درد ندارد، شوخی اور بانکپن زیادہ "متزاد" کے بڑے شائق۔

۷۔ حضرت انشاءؔ :۔ "اردو کے امیر خسرو" ہر صنف کلام پر قدرت مصنف دریائے لطافت، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، پشتو، پنجابی پر نظم میں قابو، ان کا کلام ماحول کا آئینہ ہے، ہندی شاعری کا عمدہ جز اردو میں رائج کیا۔ اکثر بحریں ہندی طرز پر ایجاد کر گئے، منطق کی اصطلاحیں ہندی میں پیدا کیں، ان کا کلام شاعری کی انسائیکلوپیڈیا ہے، کبھی عالم کبھی فلسفی، کبھی رند، کبھی ظریف۔

۸۔ حضرت مصحفیؔ :۔ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں ہے، کبھی سوز کا انداز

ہے، کبھی میر کی تقلید ہے، کبھی سودا کا ڈھنگ۔ نشاط و شباب اور رنگ و روپ کو نہایت پر کیف و رنگین طریقے سے بیان کرنا ان کا خاص طرز ہے۔

۹۔ میاں نظیر :۔ ان کا شمار کسی دور شاعری میں نہیں ہو سکتا" اپنے عہد کی ادبی، معاشی، معاشرتی، اور سیاسی تبدیلیوں میں سے ایک طرفہ تر تبدیلی ان کا طرز ہے، اس راستے پر سوائے ان کے کوئی اور نہ چل سکا "وسیع المشربی" کا اثر ان کے کلام سے ظاہر ہے آزادانہ زندگی نے ان کو شاعری کی کڈھب راہوں اور بیہڑ جنگلوں اور نارس میدانوں میں بھٹکا دیا۔ انھیں نے غزل کی راہ سے ہٹ کر "عام پسند" نظموں پر توجہ کی، اسی واسطے انداز بیان غیر معتدل ہو گیا، عوام کو خوش کرنے کے لئے جو بالعموم جاہل تھے الفاظ میں ابتذال پیدا کیا، یہ "عوام کے شاعر" ہیں، ان کا کلام سودا بیچنے والوں کی "بانی" کی طرز کا ایک اچھا اسلوب نظر آتا ہے۔

۱۰۔ حضرت رنگین :۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ "ریختی" کے پہلے شاعر ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ریختی میں انشاء کے پہلے پیرو، خلاصہ یہ کہ ریختی سے ان کو طبیعتہً لگاؤ ہے۔

۱۱۔ حضرت ناسخ : لکھنؤ کو مرکز زبان بنانے والی دو شخصیتوں میں سے ایک، انھوں نے قواعد و عروض پر زور دیا، متروکات کو علیحدہ کیا۔ ثقیل الفاظ ترک کئے۔ فارسی و عربی، ہندی اسماء کی تذکیر و تانیث

کے قاعدے بنائے۔ ان قواعد کی پابندی پر اتنا زور دیا کہ کلام بے کیف ہو گیا، فن کے لحاظ سے "پہلوان سخن" ہیں۔ بناوٹ اور تصنع سے کلام کی آرائش و زینت خوب کرتے ہیں۔ کلام ٹھوس ہے۔ شعر کی مضبوطی محاورات و الفاظ سے پیدا کی، فن سے واقفیت ان کی خاص خصوصیت ہے۔

۱۲۔ حضرت نسیم :۔ آتش کے شاگرد، مگر ان کی سی گرمیِ سخن نہیں۔ مثنوی ان کا اصلی کارنامہ ہے، ایجاد کے بادشاہ۔ ان کی مثنوی کا خاص جوہر، اختصار، پختگی کلام، چستی بندش، تناسب و شیرینی الفاظ، کمال شباب میں مر گئے نہیں تو "آتش کا پرکالہ" ہوتے۔

۱۳۔ حضرت آتش :۔ لکھنؤ کو مرکز بنانے والوں میں ثانی اثنین۔ اس دور میں درستیِ زبان کا اہم کام کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے "چمنستان اردو کو خس و خاشاک سے پاک کیا۔" اپنے کلام میں زبان کو آئینہ کر کے دکھایا۔ زبان کی صفائی، محاورات کا بہترین صرف، روزمرہ کا لطف، رنگینی و شوخی ان کے کلام کو دل کش بناتی ہے۔ شیرینی الفاظ میں "غلط العام" کو فصیح سمجھتے ہیں۔ تصوف کی چاشنی سے "اردو کے حافظ" کہلاتے ہیں۔ ثقیل الفاظ کو ترک کیا۔ نئی تشبیہات استعمال کرتے ہیں، کبھی کبھی عامیانہ مضمون بھی کہہ جاتے ہیں۔

۱۴۔ حضرت مومن :۔ فارسی کی دل پسند ترکیبوں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے سادی سی بات کو شاندار اور دل پذیر بنا دیتے ہیں تھوڑی سی پیچیدگی لطیف طنز، اچھوتی تشبیہیں، نادر استعارے پیدا کیے، جذبات نگاری

یں اصلیت کا پہلو نمایاں، مثنویاں بھی کہی ہیں۔ قصیدہ گویوں کی صف اول میں جگہ ہے۔

۱۵۔ حضرت ذوقؔ :۔ تصوف کی چاشنی، کلام میں شوخی اور تخیل میں بلندی "ضرب المثل" خوب نظم کرتے ہیں، اشعار عام طور سے صاف اور سادے کسی قدر سنوٹ اور اسی کے ساتھ رعایت لفظی ان کا خاص طرز ہے، کلام میں کیفیت ہے۔ قصیدہ میں "فخر سودا" بڑے ذہین، باوجود سنگلاخ زمین کے ذہن کو رکاوٹ نہیں ہوتی، وسیع معلومات کے آدمی ہیں، پست کلام کو اپنی اصلاح سے بلند کرنا انھیں کا کام ہے۔

۱۶۔ حضرت شوقؔ :۔ (نواب مرزا) لکھنؤ کی عاشقانہ شاعری کے علمبردار، آتش کے شاگرد۔ ان کا کارنامہ مثنوی "زہر عشق" ہے جس میں اپنے زمانہ کے خلاف "مافوق البشر" سے احتراز کیا ہے، کلام میں سچے جذبات کا پر تاثیر اظہار ہوتا ہے، ان کے اخلاف نے ان کی زندگی کے واقعات کو اس طرح پیش کیا کہ یہ "لکھنؤ کے بدنام شاعر" ہو گئے۔

۱۷۔ حضرت غالبؔ :۔ ان کی اردو شاعری کے تین دور ہیں، جدت اور ندرت ہمیشہ موجود، انھیں نے پامال راستہ کو چھوڑ کر نیا راستہ ایجاد کیا، اہل ہند کو پوری طرح فارسی شاعری کی سیر کرا دی۔ خیال میں بلندی، مضامین میں ندرت، جدید و پاکیزہ تشبیہیں، نادر و دل پسند استعارے، علوئے تخئیل بڑے بڑے مضامین اختصار کے ساتھ، نئی ترکیبیں، سامعہ نواز مرکبات کلام میں تاثیر، تصوف و فلسفہ کے مضامین کی بہتات، تنوع تخیل فلسفیانہ

عمق اور نفسیاتی پہلو کے ساتھ۔

۱۸۔ حضرت انیسؔ :۔ ان کو زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جیسی خالق کو مخلوق پر" ہر ہر لفظ کی قوت اور معنویت سے واقف، سلاست و روانی میں ان کا کلام اک آبشار مصفا ہے۔" حفظ مراتب، ہر شخص کے کردار کی پوری تصویر نمایاں کرنا" شاعرانہ مصوری میں ید طولی جہاں مصوری کا قلم ہو وہاں انیسؔ کا قلم اپنی پختہ کاری دکھاتا ہے۔ بیان رزم میں مرقع کشی کرتے ہیں" زبان کی لطافت، محاورات کی دل آویزی، مضمون کی دل کشی پڑھنے والے کو مسخر کر لیتی ہے۔" سلاست و روانی میں انکا شریک کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، ان کے کل کلام بھر میں ابتذال کا کہیں نام نہیں ہے۔ متانت و سنجیدگی کلام کی روح ہے۔" سیرت نگاری اور مکالمہ میں انیسؔ کا مدمقابل کوئی شاعر نہیں۔ ہر شخص کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہیں، نفسیات کے زبردست ماہر، ان کا کلام وقار اور تمکین کے ساتھ اخلاق حسنہ کا آئینہ ہے۔" مقتضائے حال اور مقتضائے وقت ان سے بہتر کسی کو نصیب نہیں۔

۱۹۔ حضرت دبیرؔ :۔ نہایت پر گو تھے، شوکت الفاظ ان کی امتیازی خصوصیت ہے جدید تشبیہات و استعارات استعمال کرتے ہیں جو اکثر بھیانک ہو جاتے ہیں، الفاظ متعلقہ سے کلام میں زور پیدا کرنا ان ہی کا کام ہے۔ بڑے مضمون آفریں۔" عروض کے پرستاروں کے واسطے آپ کا کلام ایک دلچسپ چمنستان۔" صنایع اور بدایع سے اتنا مرصع کر دیتے

کہ اصلیت کی زمین چھپ جاتی ہے، ۰ اختصار کی خوبی مفقود ہے۔ ۰ رعایت لفظی اور مبالغہ کا زور شور ہر مقام پر موجود ہے۔ ان کے بنائے ہوئے گلدستے میں گلاب کے ساتھ گیندا اور جوہی کے ساتھ گوبھی کا پھول بیک وقت نظر آئے گا۔

۲۰۔ میاں جان صاحب :۔ ریختی یعنی عورتوں کی زبان میں عاشقانہ مضامین اور روزمرہ کی زنانہ گفتگو کو معراج کمال تک پہونچایا، یہی ان کا کارنامہ ہے۔ یہ لکھنؤ کی ریختی کے خاتم اور متمم ہوئے۔

۲۱۔ حضرت محسن :۔ حضرت امیر مینائی کے دوست اور معروف بہ "شاعر نعت" اور مداح رسول کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، سودا کے قصیدہ لامیہ کا جواب لغت میں ہندی قوافی کے لزوم مالایلزم کے ساتھ کہا ہے، ان کے قصیدے میں غزل بہت کامیاب مانی جاتی ہے۔

۲۲۔ حضرت تعشق :۔ اہل لکھنؤ ان کو مرکز زبان دہلی کے تمام ارکین کا مدمقابل مانتے ہیں، غزل اور مرثیہ دونوں کے استاد، ناسخ کے شاگرد ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکت خیال، تاثیر اور خوبی کے لئے مشہور رہے، صحت زبان میں ان کو بانیان مرکز لکھنؤ کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے۔

۲۳۔ حضرت امیر مینائی :۔ لیاقت علمی میں منفرد، صاحب امیر اللغات صاحب تحقیق و زبان و محاورات، مصنف "سرمہ بصیرت" الفاظ کا صحیح استعمال جاننے والے کلام میں فصاحت کے ساتھ، ترنم، شوخی

متانت، کل کلام صاف و سلیس، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، تصوف کی جھلک،
مرکز زبان لکھنؤ کے ایک اہم رکن۔

۲۴۔حضرت داغ :۔ دہلی میں بیٹھ کر لکھنؤ کی زبان و محاورات بولنے والے " زبان میں صفائی روانی، ثقیل الفاظ سے گریز، فارسی ترکیبیں بہت کم۔ کلام میں چلبلا پن اور شوخی، کبھی عامیانہ رنگ ابھرتا ہے، معاملہ بندی، شباب اور سرمستی کی تصویریں جرات کے رنگ میں کھینچے ہیں۔ اکثر بے ساختگی مذاق سلیم پر بار ہو جاتی ہے، کلام میں عمق کم ہے۔ غزلوں میں رطب ویابس بہت کچھ ملا ہوا ہے۔"
ارباب نشاط کے شاعر ہیں۔

۲۵۔حضرت جلال :۔ زبان کی صحت اور اصول فن کی پابندی میں ناسخِ ثانی قواعد و ضوابط عروض پر خاص توجہ، لفظی بحث اور تذکیر و تانیث کا جھگڑا طے کر دیا، ایک لغت، اور قواعد و عروض کی کتاب مرتب کی۔ علمی قابلیت سے ممتاز، علو تخیل اور پر جوش انداز بہت کم۔ "ان کا کلام اغلاط سے پاک و منزہ ہے۔" معنویت اور سادگی میں مشہور۔

۲۶۔حضرت برق :۔ منشی جوالا پرشاد صاحب نہایت ذہین اور قابل ادیب، خوش فکر شاعر، بذلہ سنج نشاد، اچھے ناول نویس، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں بالکل لکھنؤ کے پکے رنگ میں شعر کہتے ہیں، غزل اصل میں غزل رہتی ہے۔

۲۶۔حضرت سرور :۔ نہایت امنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی خوش دلی کا

ثبوت دیتے ہیں، ہندستان کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، سودیشی مال بدیشی پیداوار پر ترجیح دیتے ہیں، مادی چیزوں سے روحانی منزلوں تک پہونچنے کی کوشش کی، حب وطن کے جذبہ میں سرشار، الفاظ میں ترنم، نادر اور نئی تشبیہیں کثرت سے استعمال کیں۔

۲۔ حضرت حالی :۔ جدید شاعری کے علمبردار، غزل گوئی ترک کرکے نئے نئے عنوانات پر نظمیں کہیں، زبان میں سادگی کو اتنا بڑھایا کہ سوقیت کے قریب تر پہونچ گئے، جدید طرز پر جو غزلیں کہیں ان کی شگفتگی وسلاست کالعدم ہوگئی۔ اس ادبی تجربہ میں ناکام ہونے پر نظمیں کہنے لگے پندنامہ سعدی اور عطار کی طرح ایک طولانی مجموعہ اپنی یادگار میں چھوڑا، اس سب خشک کلام میں "مدوجزر اسلام" ایک مایۂ ناز کارنامہ ہے اور یہی ان کا شاہکار ہے۔

۲۹۔ حضرت رشید :۔ غزل میں اپنے چچا تعشق کے شاگرد، مرثیہ میں اپنے نانا انیس کے پیرو، ان کی غزلوں میں سلاست زبان اور حلاوت بیان پابندی محاورات کا بہت خیال ہے، ان کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں، انھیں نے مضمون "پیری" پر بہت عمدہ اور پسندیدہ رباعیاں کہیں۔

۳۰۔ حضرت اکبر :۔ وحید کے شاگرد (وحید آتش کے شاگرد تھے) صفائی بندش، سلاست بیان، سادگی الفاظ خاص طرز ہے، ملک و قوم کی حالت سدھارنے اور مغرب کی کورانہ تقلید سے باز رکھنے کے لئے قوم

کو گدگدا کر اور ہنسا ہنسا کر متنبہ کیا، روزمرہ کی زندگی کی لغزشوں سے ہشیار کرنے کے لئے مذاقیہ چٹکلوں کی صورت میں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہنا شروع کیں اور نصیحت کی تلخی کو مذاق کی شیرینی میں ملا جلا کر پلا دیا۔ ان کی طباعی معمولی الفاظ میں ہزاروں معنی بھر دیتی ہے، اکبر کے بدھو، جمن، کلو وہ الفاظ ہیں جن میں طویل معنویت بھری پڑی ہے۔ انکا پیام ہندو مسلمان دونوں کو یکساں ہے۔ یہ ایسے ساحر ہیں کہ اپنے معمول کو ہنسا ہنسا کر بے آپ کر دیتے ہیں۔

۳۱۔ حضرت چکبست :۔ بچپن سے شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، نہ کوئی استاد نہ کوئی تخلص، آتش، غالب، انیس کا کلام اتنا پڑھا کہ اس سے روحانی فیض پا گئے، کل کلام میں صفائی و سلاست انتہائی کو پہونچی ہوئی ہے، غزل میں آتش کی زبان، غالب کا فلسفہ، مسدس میں انیس کا پرتو، ان کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا، لوگوں کو مغرب کی کورانہ تقلید سے پرہیز کرنا بتاتے ہیں۔

۳۲۔ حضرت شاد :۔ زبان کی شیرینی، صفائی سادگی اور تاثیر بڑھا دینے والے الفاظ کا انتخاب ان کا خاص طرز ہے۔ روزمرہ کے عام فہم الفاظ میں ادق مضامین نہایت کامیابی سے ادا کر دیتے ہیں استادی اور کہنہ مشقی کلام سے ظاہر ہو رہی ہے، انداز بیان میر سے بہت ملتا ہے۔ محاورات بہت صفائی سے نظم کرتے ہیں۔

۳۳۔ حضرت ریاض :۔ ان کی خمریات مشہور ہیں، شباب کی رنگینیاں

حسن و عشق کی عملی زندگی کی داستان بیان کرتے ہیں، ان کے کلام میں سوز و گداز کے بجائے کیف و سرور ہے۔ شراب اور اس کے متعلقات کی بابت گفتگو ان کا حصہ ہے، ان کا معشوق پیکر وہم و خیال نہیں بلکہ ایک جنس لطیف گوشت پوست و استخواں سے مجسم۔

۲۴۔ حضرت عزیزؔ :۔ عامیانہ مذاق و مضامین کو ترک کیا، الفاظ میں ترنم ہے کلام میں سوز و گداز پیدا کیا، تصنع سے کلام کو پاک کیا، کبھی کبھی معنویت میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ الفاظ ان کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتے حضرت صفیؔ مرحوم سے اصلاح کلام کا فیض پایا۔

۲۵۔ حضرت ظریفؔ :۔ یہ ایک ناصح مشفق ہیں جو ظرافت کے رنگ میں پیام نصیحت دیتے ہیں، پند و نصیحت کی پوست اور تلخی کو ظرافت کے شیر و شکر سے امتزاج دے کر اصلاحی کد و کاوش کی ہے یہ شخص وہ مصلح قوم و ملت ہے جو ہنسی ہنسی میں سخت اور کڑوی باتیں کہہ جاتا ہے، تلخ دوا کی گولیوں کو شکر میں لپیٹ کر حلق کے نیچے اتار دیتا ہے۔ ہنسی ہنسی میں نشتر کی تیز نوک چبھو کر مادۂ فاسد کو نکال دیتا ہے۔ ان کے دل میں وطن کے سدھارنے کا احساس موجود ہے، یہ شخص ہندو مسلمان دونوں کو ہم وطن سمجھ کر دونوں کو یکساں کوشش سے اپنی دوا پلاتا ہے۔

۲۶۔ سر ڈاکٹر اقبالؔ :۔ بچپن سے شاعری کا شوق، داغؔ کے شاگرد غالبؔ کے پیرو ہو کر اپنے نسخۂ کیمیا سے اہل وطن کی گری ہوئی حالت

سنبھالتے ہیں، ان کا پیام "عمل" ہے، یہ ایک ناامید و مایوس کو بھی میدان عمل میں لاکھڑا کرتے ہیں، مشرق کو مغرب کی کورانہ تقلید سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، مادہ پرستی کے بجائے حقیقت شناسی کا سبق دیتے ہیں، مغربی خزانوں کے جواہرات کو تراش خراش کر مشرق کے بازار میں پیش کرتے ہیں، ان کا شیشۂ دل بادۂ حب وطن سے لبریز ہے، اردو کے خزانے میں اچھے اچھے موضوعات اور، عمدہ خیالات کا اضافہ کیا، قواعد عروض کے بہت سے بندھن ڈھیلے کر دئے بہت سے کاٹ دئے۔

۴۷۔ حضرت فانی :۔ ان کی غزلیں یاس وحزن و ملال کی آئینہ دار ہیں، یہ غالب کی طرح متنوع نہیں ہیں اور نہ مرزا نوشہ کی طرح انھیں نے زندگی کے ہر پہلو کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے قطعات و رباعیات میں ہمہ گیری و جدت ہے۔

۴۸۔ حضرت ثاقب :۔ نہایت منکسر المزاج، سادگی سے زندگی گزار دی تصنع اور بناوٹ سے کبھی تعلق نہ رکھا، یہی حالت اُن کے کلام میں ہے کہ بناوٹ اور تصنع کا نام نہیں، بالکل حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، یہ سچے "پیرو میر و غالب" ہیں زبان کی صفائی کے ساتھ تلاش مضمون کی کاوش، بڑے بڑے خیالات کم سے کم الفاظ میں خوب ظاہر کر دیتے ہیں "شخصیت کو اتنا اہم بنا دیتے ہیں کہ انسان "انسان" معلوم ہونے لگتا ہے، پاکیزگی، صفائی، نچے ہوئے الفاظ

و محاورات، خودداری، زورِ کلام و پروازِ تخئیل ان کی خصوصیات ہیں۔

۳۹/۴۰۔ دونوں شاہان دہلی و لکھنؤ کا کلام "کلام الملوک ملوک الکلام ہے" اس میں کیا کلام کی گنجائش ہے۔

۴۱۔ حضرت صفیؔ :۔ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن یہ خاص طور سے اپنی مثنوی اور قومی نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ لکھنؤ کے شعرا میں سب سے پہلے استاد ہیں جنھوں نے اپنے فن سے وہ کام لیا جسے مقصدی اور اصلاحی کہہ سکتے ہیں آپ نے لکھنؤ کی شاعری کے اسکول کو تمام عیوب سے پاک و صاف کر دیا۔ کلام میں نہ بے جا مبالغہ ہے اور نہ بدنما رعایت لفظی، زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور عروض و معانی و بیان پر پورا عبور، فصاحت و بلاغت نمایاں، زبان کی سادگی، طرز ادا کا ندرت، محاورات روزمرہ کی شگفتگی، تشبیہات کی جدت ہے، آپ صاحب طرز استاد ہیں فلسفہ حیات اور موجودہ عہد کے اہم مسائل پر بھی آپ کا کلام چراغ ہدایت بن سکتا ہے۔

۴۲۔ حضرت آرزوؔ :۔ میدان سخن کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی، مرثیہ، غزل اور گیت آپ کی خاص چیزیں ہیں آپ صاحب طرز ہیں کلام میں شوخی، سلاست زبان، شیریں محاورات اور ضرب الامثال نہایت خوبی سے نظم کرتے ہیں غزلیات شیریں و دلآویز اور موسیقیت سے پُر ہیں، جدید خیالات کو بڑی خوبی سے اپنایا "خالص اردو" آپ کی خاص ایجاد ہے، موت سے کچھ دن پہلے غزل کے لئے کچھ نئی بحریں تجویز کی تھیں، اور تجربتاً غزل کہنا شروع کی تھیں۔ افسوس ہے کہ یہ کلام اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

ضمیمہ چہارم (د)

اشعار تعارف

نوٹ :- ہر شاعر کے داخلے کے وقت اگر یہ شعر پڑھ دیے جائیں تو ان کا تعارف مجمع سے ہو جائے گا۔

۱- ولیؔ :-

اے ولیؔ غیر آستانۂ یار　　جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

۲- سوداؔ :-

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

۳- دردؔ :-

ہوں قافلہ سالار طریق قدما دردؔ　　جوں نقشِ قدم خلق کو میں راہنما ہوں

۴- حسنؔ :-

نہ رُکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو　　حسنؔ تجکو کیا رات غم تھا کسی کا

۵- میرؔ :-

اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میرؔ　　پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۶- جرأت :-

جرأت کی غزل جس نے سُنی اُسنے کہا ؟　　کیا بات ہے! کیا بات ہے! کیا بات ہے واللہ

۷- انشاءؔ :-

منظور دوستی جو تمھیں ہر کسی سے ہے　　اچھا تو کیا مضائقہ انشاءؔ سے کیں کہی

٨۔ مصحفی :۔

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تخت شہی — کیا کرے گا تو عبث ملک سلیماں ہو کر

نظیر :۔

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر — پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

١٠۔ رنگین :۔

دل پہ میرے نقش ہیں رنگیں کی ساری شوخیاں — اسکی بھجوائی ہوئی مہندی لگاؤں زود پار

١١۔ ناسخ :۔

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ — شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

١٢۔ نسیم :۔

کس سمت چمن میں ہو نسیم . لو لو — آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

١٣۔ آتش :۔

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر نبھے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

١٤۔ مومن :۔

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

١٥۔ ذوق :۔

قسمت ہی سے مجبور ہوں اے ذوق وگرنہ — ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

١٦۔ شوق :۔

کیا شوق پھر اب اس بت عیار سے بگڑی — ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

۱۷۔ غالب :-

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۱۸۔ انیس :-

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس — عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

۱۹۔ دبیر :-

نگاہ مہر کی ہے یہ کہ مدح گویوں میں — دبیر بھی ترے ارباب انتخاب میں ہے

۲۰۔ جان :-

جان صاحب رہا وہ تنگ سدا — جس کو حاصل کوئی کمال ہوا

۲۱۔ محسن :-

نبی کے صدقے میں محسن ملے قصور میں حور — ہمارے عیب غضب ہیں، ہنر نہ ہو نہ سہی

۲۲۔ تعشق

کہتے ہیں دل کی چوٹ کا ہے اثر — یہ تعشق جو درد رہتا ہے

۲۳۔ امیر :-

صیاد ادھر خلاف ادھر باغباں امیر — ہم بار خاطر قفس و آشیاں رہے

۲۴۔ داغ

جو وہ نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا — تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

۲۵۔ جلال :-

کچھ مستفیض ان سے ہوئے ہم نہ اے جلال — جی لوٹتا ہے ناسخ مغفور کے لئے

۲۶۔ برق :-

وہ تو برس رہے ہیں غضب میں بھرے ہوئے — اے برق تیرے دل کی لگی کو بجھائے کون

۲۷۔ سرور:۔

شعر کہنے میں کچھ سرور نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اب جہاں سے سرور اٹھتا ہے

۲۸۔ حالؔی:۔

ہو چکے حالؔی غزلخوانی کے دن ‌ ‌ ‌ ‌ راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

۲۹: رشید:۔

رشید افسوس بھولے کاتبِ تقدیر سے کہنا ‌ ‌ ‌ ‌ مجھے پہلے بتا دینا جو لکھنا ہو مقدر میں

۳۰۔ اکبر:۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب

اس پارک میں آخر اے اکبؔر ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

۳۱۔ چکبست:۔

ذکر چکبستؔ کا بزم شعراء میں کیا ہو ‌ ‌ ‌ ‌ یہ تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

۳۲۔ شاد:۔

شعر کہتے ہیں کسے بزم میں کھل جائے گا ‌ ‌ ‌ ‌ شاؔد آیا نہ کہو، حافظ شیراز آیا

۳۳۔ ریاض:۔

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن ‌ ‌ ‌ ‌ ریاضؔ آپکو کچھ ہمیں جانتے ہیں

۳۴۔ عزیز:۔

نہیں افکار دنیادی سے فرصت ‌ ‌ ‌ ‌ عزیزؔ اس شاعری میں نام کیا ہے

۳۵۔ ظریف:۔

پاسبانِ درِ دلدار سے پوچھو تو ظریفؔ ‌ ‌ ‌ ‌ کیوں جی اس گھر میں زنانہ ہے کہ مردانہ ہے

۳۶۔ اقبال :۔

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں میں نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہہ دام ابھی

۳۷۔ فانی :۔

فانی دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

۳۸۔ ثاقب :۔

جلوہ فروغِ حسن کا ثاقب کے دل میں ہے
ملتا ہوا اسی سے جو بالائے طور تھا

۳۹۔ ظفر :۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

۴۰۔ اختر :۔

چاک دل کی دوا کہاں اختر
اس کا بخیہ نہ ہوگا سوزن سے

۴۱۔ صفی :۔

تفتہ جاں وہ ہیں صفی ہم کہ بقول مومن
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

۴۲۔ آرزو :۔

آرزو ہاتھ وہ نہ چھٹنے پائے
جس نے گرتے میں مجھ کو روکا ہو